PRINTED BOOK

سہ ماہی ممبئی

افکار رضا

جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء / جمادی الآخر تا شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ

''فتاویٰ رضویہ تیرہویں صدی ہجری کے عشرۂ آخر اور چودھویں صدی ہجری کی چار دہائیوں میں لکھے جانے والے ان فتاویٰ کا مجموعہ ہے جو امامِ اہلِ سُنّت، مجددِ دین و ملّت شاہ احمد رضا بریلوی قادری نوری نوراللہ مرقدہٗ کی فطانت، ذہانت و ذکاوت، تبحر علمی اور تفقہ فی الدین کا ایک عظیم ترین شاہ کار ہے اور ۷۰ سال گزر جانے کے بعد بھی ایسا جامع، مبسوط، مدلل اور مبرہن کوئی دوسرا مجموعۂ فتاویٰ نہ تو احناف کے ہاں مرتب ہوسکا اور نہ ہی کسی دوسرے مذہب اہلِ سُنّت و جماعت میں مرتب ہوا۔''

(پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری، دائرہ معارف امام احمد رضا۔ ص ۱۶)

بشکریہ جناب خلیل احمد رانا صاحب

R.N.I. Registration No.: 71248/99

امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کی ترویج کا علمی علم بردار

سہ ماہی افکارِ رضا ممبئی

جولائی تا ستمبر ۲۰۰۷ء جلد ۱۳ شمارہ ۳ (۴۹) جمادی الآخر تا شعبان المعظم ۱۴۲۸ھ

مدیر: محمد زبیر قادری (موبائل: 98679 34085)

منیجر: محمد اسحٰق برکاتی (موبائل: 93239 54522)

Distributed in Pakistan By :

Markazi Majlis-e-Reza

P.O.Box: 2206, Lahore, Pakistan

Distributed in England By :

The Islamic Times

C/o. 138, Northgate Road,
Edgeley, Stockport, SK3 9NL ENGLAND

Distributed in Australia By :

SHEHZAD ALI

P.O. Box: 51, Lurnea 2170.
NSW, AUSTRALIA

رابطہ کا پتہ: Correspondence Address:

تحریکِ فکرِ رضا **Tehreek-e-Fikr-e-Reza**

C/o. AJMERI BOOK DEPOT, 251-253, MAULANA AZAD ROAD, SHOP NO.8, ZAINAB TOWER, MUMBAI - 8

آفس کا پتہ: **Office Address:**

95, Undria Street (Chowki Mohalla), Mumbai - 400 008 India

Website: www.fikreraza.net Email: editor@fikreraza.net

پرنٹر پبلشر محمد اسحٰق محمد عمر نے ٹاپ پرنٹنگ پریس، 18، شنکر بلڈنگ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 400008 سے چھپوا کر دفتر 167، ڈمٹیمکر روڈ، ناگپاڑہ، ممبئی۔ 400008 سے شائع کیا۔

بشکریہ جناب خلیل احمد رانا صاحب

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی

اللہ کے نام سے شروع جو بہت مہربان رحمت والا

متوسلینِ رضا

ضروری اعلان: ان شاء اللہ عزوجل اگلا شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء) ۵۰ واں شمارہ ہونے کی نسبت سے خاص نمبر ہوگا۔ جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ یہ شمارہ بلا قیمت (مفت) نہیں دیا جائے گا۔ ہدیہ: سو-/100 روپے ہوگا۔ اپنی کاپیاں بک کرالیں۔ سہ ماہی افکار رضا کا یہ آخری شمارہ ہوگا۔

نوٹ: رابطے کا پتہ تبدیل ہوگیا ہے۔ صفحہ اوّل سے نوٹ کرلیں۔ آیندہ خط و کتابت نئے پتے پر کیجیے۔

"نعت پاک"

نثار کریمی۔ کریم الدین پور، گھوسی۔ مئو

رتبہ ہے بڑا ' سب سے بڑا ' میرے نبی کا
مدّاح خدا ہے ......بخدا ' میرے نبی کا

یہ دیکھ کے ' ہوش اُڑ گئے بوجہلِ لعیں کے
کنکریوں نے کلمہ جو پڑھا ' میرے نبی کا

بُو ' کس کو پسند آئے گی تیری اے گُلِ خُلد
گر مجھ کو پسینہ نہ ملا ' میرے نبی کا

اللہ رے! اے سنگِ گراں تیرا مقدر
سینے پہ تیرے پاؤں پڑا ' میرے نبی کا

اک روز جگا ' میری بھی قسمت مرے مولا !
پیغام لیے آئے صبا ' میرے نبی کا

بے نور جو آنکھیں تھیں ' اُن آنکھوں سے تو پوچھو
وہ دستِ شفا چیز ہے کیا ' میرے نبی کا

وہ ذات ہے سرتا بہ قدم سرِّ الٰہی !
کب راز کسی پر بھی کھُلا ' میرے نبی کا

کیا تیرا بھلا ہوگا کسی اور کی گا کے
اے طائرِ جاں نغمہ سنا ' میرے نبی کا

گر آپ نہ ہوتے ' تو نہ ہوتا کوئی عالم
کونین ہے صدقہ بخدا ' میرے نبی کا

سُن میری سُن ! اے آبِ بقا ڈھونڈنے والے
اک قطرہ جو مل جائے تو لا ' میرے نبی کا

ہے مرکزِ کونین وہی ذاتِ گرامی
کرتے ہیں طواف ارض و سما ' میرے نبی کا

اِس رشتۂ اُلفت کو خدا رکھے سلامت
مَیں اپنے رضا کا ہوں ' رضا میرے نبی کا

اللہ کرے یوں ہی نثار اپنی زباں سے
تو ذکر کرے صبح و مَسا ' میرے نبی کا

نایاب ہیں ہم ...... علامہ تحسین رضا خاں علیہ الرحمہ

از: محمد زبیر قادری (ایڈیٹر: افکار رضا، ممبئی)

بروز جمعہ ۳ راگست ۲۰۰۷ء کو میں ڈیوٹی سے فارغ ہوکر ابھی گھر پہنچا ہی تھا کہ مجھے اپنے موبائل فون پر ممبئی کی پہلی سُنّی اسکول "مُفتی انگلش اسکول" کے شعبۂ اسلامیات کے نگران مولانا شیخ محمد بشیر قادری کا میسیج موصول ہوا "علامہ تحسین رضا خان صاحب بریلی شریف میں وصال فرما گئے۔ حضرت کے لیے ایصالِ ثواب اور دعاے مغفرت فرمائیں۔" انا للّٰہ و انا الیہ راجعون.

اس بات کا احقر کو ہمیشہ افسوس رہے گا کہ حضرت تحسین رضا علیہ الرحمہ سے زندگی میں کبھی شرفِ ملاقات نہ ہوسکی۔ جاننے والے علما اور احباب سے حضرت کا تذکرہ سُنا اور آپ کی سوانح کے مطالعہ سے ہی حضرت کو جاننے کا موقع ملا۔

روایات میں آتا ہے کہ قیامت کے قریب علم اُٹھا لیا جائے گا۔ جس کے مفہوم میں علما فرماتے ہیں کہ دنیا سے علما اُٹھا لیے جائیں گے۔ ورنہ ہم اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ علم کا حصول پہلے سے زیادہ سہل الحصول ہوگیا ہے۔ اب علم حاصل کرنے کے لیے چین جانا ضروری نہیں رہا۔ آپ گھر بیٹھے دنیا کے علوم کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعہ سے بھی حاصل کرسکتے ہیں۔ یہاں تک کہ قرآن، تفاسیر قرآن، احادیث، شروحاتِ احادیث، فقہ اور دیگر اسلامی موضوعات پر مواد ہمہ وقت کمپیوٹر سی ڈیز، انٹرنیٹ پر دست یاب ہے۔ دین کی تفہیم کے لیے پہلے سے زیادہ کتب دست یاب ہیں۔

لیکن یہ سب کچھ موجود ہوتے ہوئے بھی آج ہم میں صحیح معنوں میں عالموں کی کمی ہے۔ اور رفتہ رفتہ وہ بھی دنیاے فانی سے منہ موڑتے جارہے ہیں۔...... آج ہماری مساجد و مجالس سے علما کا جو کردار نظر آرہا ہے اُس سے ہر شخص بدظن نظر آتا ہے۔ لوگ ہمارے کردار کی بنا پر ہم سے دور بھاگ رہے ہیں اور اغیار کی صفوں میں نظر آرہے ہیں۔ کیا اس کی وجوہات پر کبھی غور کیا ہم نے؟

عالم کی تعریف میں وہی اُتر سکتا ہے جو زمانے کا نبض شناس ہو۔ امام کہلانے کا وہی حق دار ہوسکتا ہے جس کی زمانے کے حالات پر نظر ہو۔ تبھی اُس کے وصال پر کہا جائے گا موت العالِم موت العالَم۔

یوں تو علامہ تحسین رضا علیہ الرحمہ کئی نسبتوں سے قابلِ احترام شخصیت کے مالک تھے، لیکن نسبتوں کو نبھانا، نسبتوں کا پاس و لحاظ کرنا آج سب سے بڑا کمال ہے۔ آج کے پیرزادہ، صاحب سجادہ تو آسمانوں میں اُڑتے نظر آتے ہیں۔ اور شریعت کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہوئے مسخ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

علامہ تحسین رضا، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے برادرِ اصغر استاذِ زمن مولانا حسن

رضا خان علیہ الرحمہ کے پوتے ہیں۔ آپ کے والدِ ماجد مولانا حسنین رضا خان قادری ہیں۔

علامہ تحسین رضا علیہ الرحمہ کا تعلق اس خاندان سے تھا جو صدیوں سے علم کا گہوارہ رہا۔ اور امام احمد رضا جیسی عظیم اور عبقری شخصیت آپ کے خاندان سے منسوب تھی۔ آپ نے اپنے وقت کے جید اساتذہ سے تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر آپ بھی اُن کی طرح درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اور ساری زندگی اسی کام میں صرف کر دی۔

حضور حافظِ ملت کا قول ہے کہ دین کی ترویج و اشاعت کے تین ذرائع ہیں: تصنیف، تدریس اور تقریر۔ سب سے مشکل تصنیف، اس سے کم تدریس اور سب سے آسان تقریر۔ حضرت تحسین رضا نے تدریس کا راستہ اپنا کر دین و سُنّیت کی خوب ترویج و اشاعت کی۔ اور پچاس سال سے زاید عرصے تک مختلف جامعات میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ آپ نے دارالعلوم مظہر اسلام، بریلی سے اپنے درس کا آغاز کیا۔ پھر دارالعلوم منظرِ اسلام، جامعہ نوریہ رضویہ اور اخیر میں مرکز الدراسات الاسلامیہ جامعۃ الرضا میں تدریس کے فرائض سر انجام دیتے رہے۔ اس طرح حضرت کے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں شمار کی جاسکتی ہے۔ جو اکنافِ عالم میں خدمتِ دینِ متین اور اشاعتِ سُنّیت میں سرگرم ہیں۔ اور یہ فیضان بعد وصال بھی جاری و ساری رہے گا۔

مدارس کے طلبہ کے علاوہ عوام الناس کی دینی تعلیم و تربیت کی بھی آپ کو بڑی فکر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے درسِ قرآن و درسِ حدیث کے ذریعہ سے تبلیغ و اشاعتِ دین کا بڑا کام کیا۔ الحمدللہ ۲۵ر سال تک یہ مبارک سلسلہ جاری رہا۔ اور ہزارہا ہزار افراد نے اس سے استفادہ حاصل کیا۔ لیکن حضرت اپنی بے پناہ مصروفیات سے تصنیف و تالیف کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ اور ہم سے پردہ فرما گئے۔ لیکن ہمارے پاس ایک آسان نسخہ ہے حضرت کو معنوی طور پر دوبارہ زندہ کرنے کا۔ ہمیں چاہیے کہ اُن کے درسِ قرآن و درسِ حدیث کو تحریری صورت میں ڈھال کر کتابی شکل میں شائع کر دیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی اُن سے مستفید ہوتی رہیں اور اُن دروس کے فیضان کا سلسلہ تا قیامت جاری و ساری رہے۔

اس کے علاوہ حضرت کی ایک مبسوط سوانح حیات شائع کی جائے تاکہ ہمارے لیے اُن کی شخصیت راہ نما ثابت ہو۔ اور ہمیں اُن سے سیکھ کر دوسروں کو سکھانے کی توفیق میسر آئے۔...... قحط الرجال کے اس دور میں علامہ تحسین رضا خان علیہ الرحمہ کا دم غنیمت تھا کہ اُن کے فیوض و برکات سے ہزارہا ہزار افراد مستفیض ہو رہے تھے۔ ایسے افراد ویسے ہی نایاب ہیں۔ پھر اُن کے جانے سے جو خلا پیدا ہو جائے وہ کس طرح پُر ہو سکتا ہے۔

اللہ رب العزت مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اور حضرت کے صدقے و طفیل ہمیں دین کی صحیح سمجھ عطا فرمائے۔ تاکہ ہم بھی کچھ دین کی صحیح خدمت کر سکیں۔ اور لوگوں کو صحیح بتا کر صحیح مقام تک لے جا سکیں۔

OOOOOOO

علامہ تحسین رضا خاں علیہ الرحمہ......حیات و خدمات

از : محمد صادق رضا مصباحی

المجمع الاسلامی، مبارک پور

لیجیے ایک اور افسوناک خبر سُنیے جماعتِ اہل سُنّت کے ایک عظیم عالمِ دین، امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کی علمی وراثت کے حقیقی امین، شریعت و طریقت کے جامع البحرین اور اسلاف کے سچے وارث بھی اپنی ردائے حیات سمیٹ کر آخرت کی طرف کوچ کر گئے۔ یعنی صدرالعلما مظہرِ مفتی اعظم ہند اور استاذ الاساتذہ حضرت علامہ مولانا تحسین رضا خاں صاحب قبلہ اب علیہ الرحمہ ہوگئے۔ جماعتِ اہلِ سُنّت کا وجود ایک بار پھر کاری زخم کھا کر تڑپ اُٹھا ہے۔ اس کی تڑپ کم ہو تو کیسے جماعت کے ایوان سے دھیرے دھیرے وہ حضرات کھسکتے جارہے ہیں جو شمعِ محفل ہیں، جن کے وجود سے اس کے گوشے گوشے میں زندگی کی حرارتیں دوڑ رہی ہیں، جن کی نورانی شعاعیں فکر و عمل کے زاویوں کی تشکیل کر رہی ہیں۔ اگر یہ ساری رونقیں رفتہ رفتہ ختم ہونے لگیں ان کی شمعیں گُل ہو جائیں تو ظاہر ہے ایسی صورت میں جماعت کی آنکھوں سے درد و اضطراب کے آنسوؤں کا بہہ جانا فطری ہے۔ حضور تحسین میاں علیہ الرحمہ کی شمعِ حیات کا بجھ جانا بھی اس افسوناک سلسلے سے جوڑا جاسکتا ہے۔ اتنی متبرک جو شخصیتیں بھی زندگی کی اس سرائے کو خیرآباد کہہ رہی ہیں ان کا نعم البدل تو کیا بدل بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ یہ سوال بار بار ذہن کی اوٹ سے جھانک رہا ہے کہ ان حضرات کی غیر موجودگی میں مسلمان اپنے فکر و عمل کے علاج کے لیے کس مسیحا کے در پر دستک دیں، کس قاید کی چوکھٹ پر اپنے فکر و عمل کی جبینیں جھکائیں۔ قائدینِ ملت ایک ایک کر کے قفسِ حیات سے آزاد ہوتے جارہے ہیں اور کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ الایۃ کی تصدیق برابر حاصل ہوتی جارہی ہے۔ اب صرف ان کی پاکیزہ یادوں کے سہارے ہی اور ان کی متبرک اور پاکیزہ زندگی ہی کو قبلہ نما بنا کر کاروانِ حیات کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے۔

اس تمہید کا حرف حرف حضرت تحسین میاں علیہ الرحمہ کے آئینۂ حیات میں صاف اور واضح نظر آتا ہے۔ آج جب اُن کی حیات و خدمات کی مصوری کرنے بیٹھا ہوں تو موت العالِم موت العالَم کی کہاوت پوری توانائی کے ساتھ اپنی تعبیر کر رہی ہے۔

حضرت صدرالعلما کے والد ماجد اور جدِّ محترم :۔ حضور صدرالعلما تحسین میاں علیہ الرحمہ کے والدِ ماجد کا اسم گرامی مولانا حسنین رضا خاں قادری ہے۔ آپ کی ولادت ۱۳۱۵ھ میں بریلی شریف میں ہوئی۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔ دارالعلوم منظر اسلام بریلی میں تدریسی خدمات انجام دیں۔

کچھ دنوں کے بعد ''حسنی پریس'' قائم فرمایا۔ اس سے اعلیٰ حضرت کے بہت سے رسائل شائع ہوئے۔ آپ نے کئی کتابیں تصنیف فرمائیں۔ ۱) دشتِ کربلا ۲) وصایا شریف ۳) نظامِ شریعت ۴) سیرتِ اعلیٰ حضرت ۵) اسبابِ زوال۔ وغیرہ وغیرہ۔

مولانا حسنین رضا خاں علیہ الرحمہ کے والد اور حضرت صدر العلما کے دادا، استاذِ زمن مولانا حسن رضا خاں علیہ الرحمہ تھے، جو جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق شاعر اور زبردست ادیب تھے۔ اردو کے عظیم شاعر و ادیب اور مستند استاذِ سخن حضرت داغ دہلوی کی شاعری میں شاگردی اختیار فرمائی تھی۔ آپ کی شاعری اس درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی جیسے ادیب و شاعر بھی آپ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے تھے۔ علی گڑھ سے نکلنے والا ''اردوے معلّٰی'' جون ۱۹۱۲ء کے صفحات اس پر شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ حضرت داغ کی شاگردی اور رئیس المتغزلین کی مدح سرائی آپ کی فکر وفن کی بلندی کا صاف پتہ دیتی ہے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کو آپ نے گھر کے اُمور سے بالکل بے نیاز کردیا تھا اور ان کو ہمہ تن خدمتِ دین میں لگادیا تھا۔ اپنی دو بیٹیوں کی شادی کے سارے انتظامات دیکھ کر جو حضرت استاذ زمن علیہ الرحمہ نے فرمائے تھے، آپ نے آب دیدہ ہوکر فرمایا ''حسن میاں جو کچھ مَیں دین کی خدمت کررہا ہوں اس کے اجر میں باذن اللہ حصہ دار تم بھی ہو۔ اس واسطے کہ تمھیں نے مجھے دین کی خدمت کے لیے آزاد کیا ہے۔'' حضرت استاذ زمن کا وصال ۱۳۲۹ھ میں ہوا۔ اعلیٰ حضرت کو ان کے وصال سے بڑا صدمہ پہنچا۔ آپ کا ایک نعتیہ دیوان ''ذوقِ نعت'' ہے۔ اور غزلیہ دیوان ''ثمرِ فصاحت'' ہے۔ ''آئینۂ قیامت'' اور ''کتابِ دینِ حسن'' وغیرہ تصنیفی خدمات ہیں۔

<u>صدر العلما کی ولادت اور تعلیم</u>:۔ حضور تحسین میاں علیہ الرحمہ نے محلّہ سوداگران بریلی شریف میں ۱۴ رشعبان المعظم ۱۳۴۸ھ/ ۱۹۳۰ء کو اپنی حیات کی آنکھیں کھولیں۔ آپ کا پورا خاندان چونکہ علم کا گہوارہ تھا، امام احمد رضا جیسی عظیم اور عبقری شخصیت آپ کے خاندان سے منسوب تھی۔ خاندان کی اس علمی اور روحانی فضا میں آپ کی تربیت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مقامی مکتب سے حاصل کی۔ عربی و فارسی تعلیم کے لیے دارالعلوم منظر اسلام اور دارالعلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں داخلہ لیا۔ آپ کے اساتذہ میں محدث اعظم پاکستان مولانا سردار احمد صاحب علیہ الرحمہ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ محدثِ اعظم پاکستان کی توجہات نے آپ کی تعلیمی زندگی کے خانے کو اتنا منور کردیا کہ دیر تک اور دور تک اس روشنی کا عکس ہزاروں لوگوں تک پہنچا۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا سردار احمد صاحب نے پاکستان کے شہر فیصل آباد میں ایک عظیم درس گاہ جامعہ رضویہ مظہر اسلام قائم فرمائی۔ آپ وہاں تشریف لے گئے اور چھ ماہ کی قلیل مدت میں دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی۔

اساتذۂ کرام: آپ نے اپنے وقت کے جلیل القدر اور اجلہ علما سے کسب فیض فرمایا۔ حضرت صدر الشریعہ علامہ امجد علی مصنف بہار شریعت سے تفسیر جلالین شریف پڑھی، سرکار مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ سے فتویٰ نویسی سیکھی اور ان سے علم و روحانی فیض حاصل فرمایا۔ مولانا سردار احمد محدث اعظم پاکستان سے علم حدیث کی تکمیل فرمائی۔ ان کے علاوہ مولانا غلام جیلانی رضوی اعظمی، مولانا قاضی شمس الدین رضوی جعفری مصنف قانون شریعت، مولانا غلام یٰسین پورنوی، مولانا سردار علی خاں اور مفتی اعظم پاکستان مفتی وقار الدین صاحب علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے اساطین اُمت اور اصحاب فضل و کمال کے استفادے نے آپ کو علمی سطح پر خوب خوب نہال کیا۔

زمانۂ تدریس کی ابتدا: حضور صدر العلما صاحب قبلہ نے حضور مفتی اعظم ہند علیہ الرحمہ کے حکم سے، فراغت سے پہلے ہی دار العلوم مظہر اسلام بریلی شریف میں درس دینا شروع کر دیا تھا۔ لیکن جب آپ کے استاذ گرامی مولانا سردار احمد صاحب علیہ الرحمہ پاکستان تشریف لے گئے اور وہاں ایک عظیم الشان دار العلوم قائم فرمایا تو آپ کے علمی ذوق و شوق نے آپ کو بریلی چھوڑ کر پاکستان جانے پر مجبور کر دیا اور وہاں صرف چھ مہینے میں دورۂ حدیث کو مکمل کیا۔ وہاں سے واپسی پر پھر دار العلوم مظہر اسلام کی تدریس سے جڑ گئے۔ بعض وجوہات کی بنا پر ۱۹۷۵ء میں آپ دار العلوم مظہر اسلام چھوڑ کر دار العلوم منظر اسلام میں بحیثیت شیخ الحدیث اور صدر المدرسین تشریف لے آئے اور سات سال تک آپ ان عہدوں کو بحسن و خوبی رنگ و روغن عطا کرتے رہے۔

۱۹۸۲ء میں بریلی شریف کے محلہ باقر گنج میں جب جامعہ نوریہ رضویہ کا قیام عمل میں آیا تو آپ یہاں تشریف لے آئے اور ۲۳ سال تک شیخ الحدیث کی حیثیت سے تعلیم دیتے رہے۔ عاجزی و انکساری کا یہ عالم ہوتا کہ اپنے گھر کانکر ٹولہ (پرانا شہر) سے جامعہ نوریہ رضویہ تک رکشہ پر بیٹھ کر تشریف لے جاتے۔ اگر آپ چاہتے تو آپ کے ادنیٰ اشارے پر گاڑی کا انتظام ہو جاتا لیکن حضرت نے رکشے میں جانا آنا پسند فرمایا۔ حضرت کے زمانۂ تدریس میں راقم السطور کا مذکورہ جامعہ میں متعدد بار جانے کا اتفاق ہوا۔ حضرت کی زیارت اور ملاقات کا شرف بھی حاصل کرتا رہا۔ ایک مرتبہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جو وہیں زیر تعلیم تھا اور حضرت کے پاس اس کی گھنٹی بھی تھی، میں حضرت کی درس گاہ میں حاضر ہوا۔ اس وقت تک میرے شعور کی کونپلیں نہیں پھوٹی تھیں اور نہ عمر بالغ ہو پائی تھی لیکن اندازہ ہے کہ وہ شاید کوئی حدیث کی کتاب رہی ہوگی جس کا حضرت درس دے رہے تھے۔ مَیں بھی وہیں بیٹھ گیا اور غور سے سُن سُن کر اپنی سماعت کے ظرفوں کو بھرنے کی امکانی کوشش کرتا رہا۔ لیکن افسوس حضرت صدر العلما کے وہ تدریسی فرمودات اب حافظے کے چنگل سے نکل چکے ہیں۔ پھر بھی مجھے فخر ہے کہ مَیں نے ایک مرتبہ حضرت کی درس گاہ میں بیٹھنے اور ان کے فرمودات کو سننے کی سعادت حاصل کی ہے۔

جانشینِ مفتیِ اعظم ہند حضرت تاج الشریعہ علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں دامت برکاتہم العالیہ نے جب بریلی شریف متھرا پور میں ایک عظیم الشان ادارہ ''مرکز الدراسات الاسلامیہ جامعۃ الرضا'' قائم فرمایا تو حضرت صدر العلما کو دعوت دی اور شیخ الحدیث اور صدرالمدرسین کا منصب ان کو سونپ دیا۔ وصالِ پُر ملال سے قبل تک آپ یہیں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ اس طریقہ سے آپ نے بریلی شریف کے ہر بڑے ادارہ کو تدریسی زینت بخشی اور آپ کے علمی فیضان کا دریا وہاں سے بہتا رہا۔ ان چاروں علمی مراکز میں حضرت کا تدریسی دورانیہ جوڑا جائے تو کم و بیش پچپن سال ہوتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایئے تو حضرت کے طلبہ کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ صرف آپ کے مشہور تلامذہ کی اسم شماری کی جائے تو ایک طویل فہرست تیار ہوجاتی ہے۔ جن کی خدمات قابل قدر ہیں اور جو مختلف دعوتی فضاؤں میں اپنی صلاحیتوں کے ذرّے بکھیر رہے ہیں۔

بیعت و ارادت: حضور تحسین میاں علیہ الرحمہ کے والد گرامی حسنین رضا خاں علیہ الرحمہ نے آپ کو حضور مفتیِ اعظم ہند سے بیعت کرایا۔ ۲۵ رصفر المظفر ۱۳۸۰ھ/۱۹۳۴ء میں عرسِ رضوی کے پُر بہار موقع پر اجلۂ اکابر و مشائخ کی موجودگی میں صرف ۱۳ رسال کی عمر میں سرکار مفتیِ اعظم ہند نے آپ کو بیعت فرمایا۔ اسی وقت آپ کو خرقۂ اجازت و خلافت بھی عطا فرمایا۔ اور آپ کے سر پر اپنا عمامہ شریف بھی اپنے دستِ مبارک سے باندھا۔ سید العلما حضرت سید آل مصطفیٰ مارہروی، مجاہدِ ملت حبیب الرحمٰن اڑیسوی، برہانِ ملت برہان الحق جبل پوری اور حافظِ ملت شاہ عبدالعزیز محدث مراد آبادی ثم مبارک پوری علیہم الرحمۃ والرضوان جیسے بڑے بڑے مشائخ و علما نے آپ کی خرقہ پوشی فرمائی۔

صدر العلما کے خلفا: آپ کے خلفا کی تعداد یوں تو کم ہے اور سب کے بارے میں مجھے علم بھی نہیں کہ وہ کس حیثیت سے مذہب و ملت کو اپنی خدمات کا خون دے رہے ہیں۔ لیکن میں اُن چند مشہور خلفا کا تذکرہ کر رہا ہوں جن کی تبلیغی حیثیت مسلّم ہے اور جو بقدرِ ظرف مسلک و ملت کے کارواں کو اپنی خدمات و تحریکات کے ذریعہ آگے بڑھا رہے ہیں۔

۱۔ عظیم محقق و مدرس مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی صدر المدرسین جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف
۲۔ معروف خطیب مولانا تطہیر احمد رضوی مصباحی، دھونرہ بریلی شریف
۳۔ معروف خطیب مولانا صغیر احمد رضوی جوکھن پوری، رچھا بریلی شریف
۴۔ معروف عالم دین مولانا سید شاہد علی رام پوری
۵۔ نبیرۂ اعلیٰ حضرت عالی جناب محمد قمر رضا خاں برادر حضرت ازہری میاں صاحب قبلہ
۶۔ ناشر مسلکِ اعلیٰ حضرت الحاج محمد سعید نوری صاحب، بانی رضا اکیڈمی ممبئی

ان کے علاوہ جامعہ نوریہ رضویہ کے کئی اساتذہ بھی شامل ہیں۔ ۷۔ مولانا رفیق عالم مصباحی ۸۔

مولانا مشکور احمد ۹۔ مولانا عزیز الرحمٰن ۱۰۔ مولانا صغیر اختر مصباحی ۱۱۔ مولانا عبدالسلام ۱۲۔ مولانا شکیل مصباحی

عقدِ مسنون اور اولاد امجاد: جناب سعید اللہ خاں بریلوی کی صاحب زادی سے ۱۵رذی القعدہ ۱۳۸۶ھ/ ۲۶رفروری ۱۹۶۷ء میں آپ کا عقدِ مسنون ہوا، جن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور تین لڑکے۔ تینوں لڑکے تعلیم یافتہ ہیں۔ ۱) جناب حسان رضا خاں ۲) جناب رضوان رضا خاں ۳) جناب صہیب رضا خاں اور لڑکی کا نام عارفہ بیگم ہے جو رشتۂ ازواج میں منسلک ہو چکی ہیں اور کلیان (مہاراشٹر) میں قیام پذیر ہیں۔

تبلیغی اسفار: درس و تدریس، فتویٰ نویسی اور تعویذ نویسی کے علاوہ آپ نے بیعت و ارشاد کا بھی سلسلۂ زرّیں جاری رکھا۔ آپ کے مریدین کی ایک کثیر تعداد ہے جس میں علما بھی شامل ہیں۔ تبلیغ دین کے لیے آپ نے ملک و بیرون ملک کے بھی دورے فرمائے۔ پاکستان، زمبابوے، مورابی وغیرہ بالخصوص ماریشس میں متعدد بار تشریف لے گئے۔ وہاں کے معتقدین کے اصرار پر سال میں دو مرتبہ تشریف لے جاتے جلوس محمدی کی قیادت کرنے کے لیے اور مولانا ابراہیم خوشتر صدیقی کے عرس میں شرکت کے لیے۔ تا وصال یہ تسلسل قائم رہا۔ ہندستان کے مختلف علاقوں کے بھی تبلیغی دورے فرمائے۔ مقامی جلسوں میں آپ کی شرکت ناگزیز ہوتی اور ان جلسوں کی صدارت فرماتے۔ جب سے بقید ہوش و حواس ہوں مجھے یاد آتا ہے کہ حضرت صرف ایک بار میرے وطن پورن پور (پیلی بھیت) میں ایک جلسے میں شرکت کے لیے تشریف لائے تھے۔ بریلی سے پورن پور بذریعہ ٹرین آئے۔ میرے دو ساتھی جو ٹرین میں حضرت کی معیت میں تھے انھوں نے اپنی سادہ لوحی کی بنا پر پسنجر ٹرین سے سفر کیا۔ ایک تو پسنجر ٹرین کی رفتار کم ہوتی ہے دوسرے اس دن اتفاق ایسا تھا کہ ٹرین اپنی متعینہ رفتار سے بھی آہستہ چل رہی تھی۔ اور پھر مسافرین کا ازدحام بھی پریشانیوں میں اضافے کا باعث تھا۔ ساتھیوں کا بیان ہے کہ ٹرین میں اس روز بڑی دقت ہوئی۔ حضرت کے سامنے وہ عرقِ ندامت میں ڈوبے ہوئے تھے اور جلسے والے بھی اتنے سیدھے سادے واقع ہوئے تھے کہ انھوں نے اسپیشل گاڑی کا بھی انتظام نہ کیا۔ لیکن ان سب کے باوجود حضرت صدر العلما نے شکایت کا ایک حرف بھی اپنی زبان سے ادا نہ فرمایا اور نہ ہی لہجے اور گفتگو کی جبین پر کوئی شکن نمودار ہوئی۔ ذرا تصور کیجیے کہ آپ کے علاوہ اور کوئی پیر یا مقرر ہوتا تو جلسے والوں کو کتنی کھری کھوٹی سناتا؟ یہ واقعہ حضرت موصوف کے جذبۂ دینی، ملی درد، خلیق، متواضع اور منکسر المزاج ہونے کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

صدر العلما حضور مفتی اعظم ہند کی نظر میں: آپ سے قریب رہنے والے حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ حضرت کی شخصیت کا شانہ سرکار مفتی اعظم ہند علیہ الرحمۃ والرضوان کی حیاتِ طیبہ کی جمالیاتی کرنوں سے معمور تھی اور آپ کی شخصیت کا خمیر حضور مفتی اعظم ہند کی حیات مبارک کی مٹی سے اُٹھا تھا۔ جس کی وجہ سے آپ کو "مظہر مفتی اعظم ہند" کے خطاب سے نوازا گیا۔ میرے اس دعوئی کہ صدر العلما کی زندگی کی چادر پر سرکار مفتی اعظم ہند کی مظہریت کے رنگ و عکس پڑے تھے بلکہ ان کی پوری زندگی مظہریت کے خول سے

لپٹی ہوئی تھی۔ اسے مولانا سلطان اشرف صاحب کے خواب سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں ایک جلسے میں تقریر کررہا تھا کہ حضرت صدر العلما منبر پر تشریف لائے اور لوگوں نے اسی خطاب کا نعرہ لگایا۔ میں تقریر کے بعد قیام گاہ پر آ گیا اور سوگیا۔ قسمت بیدار ہوئی سرکار مفتی اعظم ہند خواب میں تشریف لے آئے۔ وہ لوگوں کو مرید فرمارہے تھے۔ فوراً میری آنکھ کھل گئی تو جلسہ گاہ کے اسٹیج سے آواز آرہی تھی اور حضور تحسین میاں مرید کررہے تھے اور زبان سے وہی کلمات ادا کررہے تھے جو میں نے سرکار مفتی اعظم ہند سے سُنے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دن سے مجھے یقینِ کامل ہوگیا کہ صدر العلما سرکار مفتیِ اعظم ہند کے مظہر ہیں۔

سرکار مفتیِ اعظم ہند آپ پر حد درجہ اعتماد فرمایا کرتے تھے اور کئی مواقع پر آپ نے صدر العلما کی تعریف بھی فرمائی۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "دو لوگ ایسے ہیں جن پر مجھے مکمل اعتماد اور بھروسہ ہے۔ ایک تحسین میاں، دوسرے اختر میاں" (حضرت ازہری میاں صاحب قبلہ)۔ ایک بار یوں گویا ہوئے "صاحب (مولانا حسنین رضا خاں والد ماجد صدر العلما) کے جتنے بھی لڑکے ہیں سبھی خوب ہیں، باصلاحیت ہیں، بالیاقت ہیں مگر ان میں تحسین رضا کا جواب نہیں۔"

ایک مرتبہ حضور مفتیِ اعظم ہند رکشے سے کہیں تشریف لے جارہے تھے ساتھ میں صدر العلما کے بھائی مولانا حبیب رضا خاں بھی تھے۔ حضرت نے فرمایا۔ "تحسین رضا گلِ سرسبد ہیں" پھر فرمایا جانتے ہو گلِ سرسبد کیا ہے؟ باغباں پھولوں کی ٹوکری میں سب سے خوب صورت اور پسندیدہ پھول نمایاں طور پر اوپر رکھتا ہے، اس پھول کو گلِ سرسبد کہتے ہیں۔"

ان ارشادات کی آنکھوں سے پوچھیے کہ صدر العلما کے متعلق سرکار مفتی اعظم ہند کو کتنا زیادہ اعتماد تھا۔ یہ اعتماد اور بھروسہ ان سے صاف چھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

تبلیغی خدمات: درس و تدریس کی بے پناہ مصروفیات کی بنا پر آپ تصنیف و تالیف پر بالفعل توجہ مرکوز نہ رکھ سکے۔ تقریر سے بھی کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا بس تدریس ہی کے ذریعہ مذہب و ملت کی تبلیغ فرماتے رہے۔ اور آپ نے ملاحظہ فرمالیا کہ صدر العلما نے تقریباً ۵۵ سال تک تدریسی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی سب سے بڑی تبلیغ عوام کے لیے درسِ قرآن و درسِ حدیث ہے۔ جو تدریسی دعوتی مساعی اور اصلاحی تحریکات پر بھاری ہے۔ چند حضرات نے مل کر حضرت سے درسِ حدیث لینے کی خواہش ظاہر کی۔ یہ درسِ حدیث نومبر ۱۹۸۲ء میں شروع کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد اس کے ساتھ ساتھ درسِ قرآن کا بھی آغاز ہوگیا۔ طریقہ کار یوں تھا کہ ہر جمعے کو بعد فجر ایک گھنٹہ درسِ قرآن ہوتا تھا۔ درسِ قرآن میں ایک رکوع کا ترجمہ فرماتے پھر اس کی تفسیر، تشریح اور توضیح فرماتے اور پھر آدھے گھنٹے کے لیے درسِ حدیث ہوتا۔ اس میں مشکوۃ شریف سے سامعین کو احادیث سنائی جاتیں اور ان کی تشریح کی جاتی۔ کہتے ہیں کہ ۲۵ سال تک یہ مبارک سلسلہ جاری رہا۔ ۱۴ سال میں درسِ قرآن مکمل ہوا۔ پہلے یہ

دونوں درس آپ کی بیٹھک میں ہوتے تھے لیکن جلد ہی جگہ تنگ پڑ گئی اور قریب کی نورانی مسجد میں درس کا انتظام کیا گیا۔ لیکن ازدحام کی وجہ سے وہ مسجد بھی تنگ دامنی کا شکوہ کرنے لگی۔ لہٰذا دوسری مسجد میں درس منتقل کرنا ناگزیر ہوگیا۔ قریب کی ایک چھ منارہ مسجد کا انتخاب کیا گیا اور تا وصال آپ نے یہیں درس دیا۔

حضرت صدر العلما ایک باکمال شاعر تھے اور آپ نے خوب شاعری فرمائی۔ اشعار کے آبگینوں میں اپنے جذبۂ دینی، ملی دردمندی اور عشق نبوی کی شراب طہور انڈیلی اور لفظوں کے جام بھر بھر عشق رسول کے مے خواروں کو ہونٹوں سے لگانے کی دعوت دی۔ آپ کے بہت سارے اشعار موجود ہیں اور زیادہ تر عشقیت کی زمین پر کہے گئے ہیں۔

وصالِ پُر ملال: عمر کی ۷۶ بہاریں دیکھنے کے بعد آخری منزل آ ہی گئی جہاں سے ایک قدم بھی پیچھے مڑنے کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں سے ماضی میں جھانکنے کے لیے آنکھوں کی روشنی باقی نہیں رہ پاتی اور ماضی کی زمین پر چلنے کے لیے ذرّہ برابر سکت ختم کردی جاتی ہے۔ اس کے آگے صرف موت کی منزل ہوتی ہے جہاں ہر ایک کو اترنا ہے۔ تو حضور تحسین میاں علیہ الرحمہ کو بھلا کیوں کر مہلت دی جاتی۔ ۱۳ اگست بروز جمعہ کو آسمانِ بریلی کا یہ روشن ستارہ ٹوٹ گیا۔ جس کی روشنی میں گمراہیت، الحادیت اور بے عملی کی تاریک پگ ڈنڈیوں پر چلنے والے اپنے قافلۂ حیات کو صحیح و سالم گزار لے گئے۔ حضرت صدر العلما مہاراشٹر کے تبلیغی دورے پر تھے ناگپور سے قریب غالباً چندر پور گاؤں میں آپ کی گاڑی پلٹ گئی اور موت کا شیریں جام آپ نے زندگی کے ہونٹوں سے لگالیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون الآیۃ لاشہ بذریعہ طیارہ بریلی لایا گیا۔ اتوار کے روز قریب دو بجے اسلامیہ انٹر کالج کے میدان میں حضرت ازہری میاں صاحب قبلہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ پھر وہاں سے لے کر آپ کے آبائی قبرستان محلہ کانکر ٹولہ میں قریب چار بجے تدفین عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ میں تقریباً ۲ لاکھ افراد نے شرکت کی۔ یہ بریلی شریف کا دوسرا واقعہ تھا کہ عوام نے اتنی کثرت سے شرکت کی ہو۔ پہلا واقعہ حضور مفتی اعظم ہند کی نمازِ جنازہ کا تھا۔ اسلامیہ انٹر کالج کا میدان بے پناہ ازدحام کی وجہ سے بار بار گلہ مند ہورہا تھا۔ عوام کی یہ کثرت اس بات کا کھلا ثبوت پیش کررہی ہے کہ آپ مقبولِ انام تو ہیں ہی مقبولِ بارگاہِ خدا بھی ہوچکے ہیں۔

بتلایا جاتا ہے کہ آپ کے وصال پر بریلی کے غیر مسلموں نے بھی اظہارِ افسوس کیا۔ اور خاص طور سے بریلی شریف کے مسلمانوں نے آپ کے جنازے میں شرکت کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی لوگوں کی نظر میں بھی آپ کی کتنی عزت و عظمت تھی۔ حضرت صدر العلما کی شخصیت اس حیثیت سے مجھے سب سے زیادہ من موہن نظر آتی ہے کہ آپ آپسی نزاع کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے۔ معاصرتی رقابت اور باہمی چپقلش حضرت کے فکر و عمل سے دور سے کوسوں دور تھی۔ علما و مشائخ کی نظر میں بھی آپ اپنی اس خوبی کی بنیاد پر محبوب بن گئے تھے۔ آپ کی پوری حیات اسلامی تعلیمات سے عبارت تھی۔ اس

میں کسی طرح کا کوئی لوچ نظر نہیں آتا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔

اس طرح ایک بابرکت دور کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ آنکھوں سے لے کر دل تک سارا پیرہن بھیگا ہوا ہے۔ تصورات کے سارے رنگ و روغن دامن پر آنسوؤں کے قطرات ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ ایک کے بعد ایک زخم کتنا سہہ پائیں گے ہم۔ درد کی شدت کو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آہ بریلی کی عظمتوں کا امین جاتا رہا۔ دنیائے اہلِ سُنّت پر عجیب سوگواری کا عالم ہے۔ آج اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ کے اس شعر کو پھر ایک نئی تصدیق حاصل ہورہی ہے۔

عرش پر دھومیں مچیں وہ مومنِ صالح ملا
عرش سے ماتم اُٹھے وہ طیب و طاہر گیا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

تبصرہ:

نام کتاب: **مفتاح العربیۃ** (حصہ اوّل، دوسرا ایڈیشن)
اعداد و تقدیم: مولانا محمد توفیق احمد، اُستاد مدرسہ عالیہ نعمانیہ، شیش گڑھ، بریلی شریف
ناشر: مجلس اسلامی، جامع مسجد شیش گڑھ، بریلی
ملنے کے پتے: مکتبہ نعیمہ، جامعہ نعیمہ، دیوان بازار، مراد آباد
قادری کتاب گھر/ قادری بک ڈپو/ برکاتی کتاب گھر/ نو محلہ مسجد، بریلی شریف
تبصرہ نگار: عاشق حسین اشرفی، دارالعلوم رضویہ، اننت ناگ، کشمیر

درسِ نظامی کی ابتدائی جماعتوں کے لیے عربی ادب میں ایک ایسی کتاب کی مدّت سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ جو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ آسان، دلچسپ اور حوصلہ افزا بھی ہو۔ نیز اس کا سلسلۂ اسباق اس نہج پر ترتیب دیا جائے کہ اس سے جہاں رٹے بغیر تراکیب کے ضمن میں مُفرداتِ لغت حفظ ہوجائیں، وہیں شعوری و غیر شعوری طور پر ترکیبی نشیب و فراز سے بھی واقفیت ہوجائے تاکہ طالبان پر صحیح ترجمہ کرنے اور عربی لکھنے بولنے کی راہیں کھل جائیں۔ اور آگے چل کر یہ اسلوب ان کے لیے ایک اچھی تمہید ثابت ہو۔

خدا بھلا کرے فاضل گرامی مولانا توفیق احمد صاحب کا کہ انھوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور ایک قابلِ ذکر کتاب بنام "مفتاح العربیۃ" تحریر فرما کر قوم کے حوالہ کردی۔ مفتاح العربیۃ کا ادبی مقام کیا ہے؟ یا وہ طالبان کے لیے کس قدر سود مند ہے؟ اس بارے میں زیادہ کچھ نہ کہہ کر اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر یہ کتاب صحیح طور پر پڑھا دی جائے تو ان شاء اللہ الرحمٰن یہ عربی ادب و انشاء کے مبادیات سے متعلق ہر طرح طالبان کی ذہن سازی کرے گی اور بتدریج ان میں عربی ادبیات کی سوجھ بوجھ پیدا کرے گی۔ بلکہ بعض اُن اہم نکات پر بھی واقف کرائے گی کہ جن سے عموماً طالبان غافل رہ جاتے ہیں اور لاشعوری طور پر تعریب و تاریب میں غلطیاں کر جاتے ہیں۔

مُجملہ یہ کتاب طالبان کے اندر عربی ادب کا ذوق بھی پیدا کرے گی اور بدستور اسباق پڑھنے کے دوران ان کا شوق بھی برقرار رکھے گی۔ اور اس طرح انھیں آگے بڑھنے کے لیے پوری طرح تیار کردے گی۔ لہٰذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ مدارس اس کتاب کو شاملِ نصاب فرما کر مصنف کی حوصلہ افزائی فرمائیں۔ OOO

حیاتِ علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ ایک نظر میں

از: خلیل احمد رانا

اللہ غریق رحمت کرے فاضلِ جلیل علامہ محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ علیہ بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، علم وفضل کے باوجود بہت ہی سادہ، منکسر المزاج اور ملنسار تھے، حرص و ہوس سے پاک، سُنّی حنفی اور مسلکِ امام احمد رضا قادری بریلوی قدس سرہٗ کے پابند اور مسائل میں اکابرِ اہل سنت و جماعت کے پیروکار تھے۔ اہل سُنّت کے لیے بہت سا علمی کام کرگئے اور آخر دم تک یہی لگن رہی۔ جن دنوں آپ جامعہ نظامیہ لاہور میں شیخ الحدیث کے منصب پر تھے، راقم آپ کی خدمت میں کئی مرتبہ حاضر ہوا، آپ بہت شفقت فرماتے۔ احقر نے ایک مرتبہ آپ کو صاحب نبراس علامہ عبدالعزیز پرہاروی چشتی نظامی رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ مجاز حافظ جمال اللہ ملتانی قدس سرہٗ کی کتاب ''سلسبیل'' (تفسیر قرآن مجید) قلمی کی فوٹو کاپی نذر کی تو بہت خوش ہوئے، ایک مرتبہ احقر کو غزالیِ زماں علامہ سید احمد سعید کاظمی علیہ الرحمہ کے درسِ قرآن (۱۹۶۱ء) کی ایک کاپی ملی جو کہ برادرم مختار احسن ایم اے مرحوم کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ احقر نے اس میں سے دو تین دن کے درس کی اقساط ترتیب دے کر آپ کو لاہور ارسال کیں اور عرض کی کہ ہم دوست اس درس کو شائع کرانا چاہتے ہیں، آپ اس کا کتابچہ کا نام تجویز فرمادیں، آپ نے دو دن بعد ہی اسے پڑھ کر اس کا نام ''توحید اور شرک'' لکھ کر مجھے واپسی ڈاک میں بھیج دیا، توحید وشرک کے نام سے یہ کتابچہ پاک و ہند میں اب تک لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوچکا ہے۔ اہل سُنّت پر آپ کے بہت احسانات ہیں کس کس کا ذکر کیا جائے، درج ذیل آپ کا سوانحی خاکہ پیش خدمت ہے:

ولادت بمقام مرزا پور ضلع ہوشیار پور (مشرقی پنجاب، بھارت)...... ۲۴رشعبان ۱۳۶۳ھ/ ۱۳ر اگست ۱۹۴۴ء

قیامِ پاکستان پر تین سال کی عمر میں لاہور ہجرت کی۔...... ۱۹۴۷ء

ایم سی پرائمری سکول لوکو انجن شیڈ لاہور سے پرائمری تعلیم کا آغاز کیا...... ۱۹۵۱ء

تکمیل پرائمری تعلیم ۱۹۵۵ء

جامعہ رضویہ فیصل آباد میں داخلہ لیا اور شیخ الحدیث مولانا سردار احمد رحمۃ اللہ علیہ سے منطق کا ابتدائی رسالہ ''صغریٰ'' پڑھا۔ ......شوال ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء

دارالعلوم ضیا شمس الاسلام سیال شریف ضلع سرگودھا (پنجاب) میں داخلہ لیا، وہاں مولانا صوفی حامد علی علیہ الرحمہ سے ''نحو میر'' کا درس لیا۔...... ۲۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۷۶ھ/ ۲ر جنوری ۱۹۵۷ء

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں داخلہ لیا، یہاں مفتی عبدالقیوم ہزاروی، مولانا غلام رسول رضوی، مولانا شمس الزماں قادری وغیرہم سے استفادہ کیا۔......شوال ۱۳۷۶ھ/ مئی ۱۹۵۷ء تا اکتوبر ۱۹۶۱ء

جامعہ مظہریہ امدادیہ بندیال (ضلع سرگودھا) میں داخلہ لیا اور استاذ الاساتذہ مولانا عطا محمد بندیالوی علیہ الرحمہ اور مولانا محمد اشرف سیالوی مدظلہ سے استفادہ کیا۔...... ربیع الثانی ۱۳۸۰ھ/ ۱۹۶۱ء

شادی خانہ آبادی۔......۱۳؍شوال ۱۳۸۳ھ/ ۱۰؍مارچ ۱۹۶۳ء

سند فضیلت (تحصیل علوم سے فراغت)۔......۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۴ء

جامعہ نعیمیہ لاہور سے تدریسی زندگی کا آغاز۔......شوال ۱۳۸۴ھ/ ۱۹۶۵ء

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں آغازِ تدریس۔......شوال ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۶ء

ولادت صاحبزادہ ممتاز احمد سدیدی۔......۲۴؍شعبان ۱۳۸۶ھ/ ۸؍دسمبر ۱۹۶۶ء

دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ ضلع سرگودھا میں ڈیڑھ ماہ تدریس۔......دسمبر ۱۹۶۶ء تا نصف جنوری ۱۹۶۷ء

مکتبۂ رضویہ انجن شیڈ لاہور کا قیام۔...... ۱۹۶۷ء

دارالعلوم اسلامیہ رحمانیہ ہری پور (ہزارہ) میں مفتی اور صدر مدرس کی حیثیت سے چار سال خدمات۔ ...... ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء

رسالہ "احسن الکلام فی مسئلۃ القیام" کی ہری پور سے اشاعت۔...... ۱۹۶۸ء

ہری پور ہزارہ میں جمعیت علمائے سرحد پاکستان کا قیام۔...... ۱۹۶۹ء

رسالہ "غایۃ الاحتیاط فی جواز حیلۃ الاسقاط" کی ہری پور سے اشاعت۔......۱۹۶۹ء

امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے فارسی رسالہ "الحجۃ الفائحہ" کا ترجمہ اور رسالہ "ایتان الارواح" کی ہری پور سے اشاعت۔......۱۹۶۹ء

کتاب "یادِ اعلیٰ حضرت" کی ہری پور سے اشاعت۔......۱۹۷۰ء

امام احمد رضا کا رسالہ "شرح الحقوق" ہری پور سے شائع کیا۔......۱۹۷۰ء

حضرت علامہ ابوالبرکات سیّد احمد قادری لاہوری علیہ الرحمہ سے سلسلۂ قادریہ میں شرف بیعت۔ ......

۱۶؍محرم ۱۳۹۵ھ/ ۲۵؍مارچ ۱۹۷۰ء بروز بدھ

ہری پور ہزارہ (سرحد) میں یوم رضا کا آغاز۔......۱۹۷۱ء

مدرسۂ اسلامیہ اشاعت العلوم چکوال (پنجاب) میں صدر مدرس کی حیثیت دو سال کے لیے آغاز کار۔......۱۳۹۱ھ/ دسمبر ۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۳ء

"سوانح سراج الفقہاء" (مولانا سراج احمد خان پوری) کی مرکزی مجلس رضا سے اشاعت۔...... ۱۹۷۲ء

سب سے پہلا مقالہ ''علامہ فضل حق خیر آبادی'' ماہ نامہ ''ترجمانِ اہل سنّت'' کراچی میں شائع ہوا۔

......فروری ۱۹۷۲ء

چکوال میں ''جماعتِ اہل سنّت'' کا قیام۔......۱۹۷۲ء

چکوال میں یومِ رضا کا آغاز۔......۲۷ر صفر ۱۳۹۳ھ/۱۲ر مارچ ۱۹۷۲ء

امام احمد رضا کے رسائل ''رادالقحط والوباء''، ''اعزالاکتناہ''، اور ''غایۃ التحقیق'' کی چکوال سے اشاعت۔......۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء

تقریبِ یومِ رضا و فضلِ حق خیر آبادی بمقام چکوال۔......۱۵ر صفر ۱۳۹۳ھ/ ۲۱ر مارچ ۱۹۷۳ء

جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور میں دوبارہ تدریس کا آغاز۔......شوال ۱۳۹۳ھ/۱۹۷۳ء

مکتبۂ قادریہ لاہور کا قیام۔......دسمبر ۱۹۷۳ء

جامع مسجد عمر روڈ اسلام پورہ لاہور میں آغاز خطابت۔......۱۹۷۴ء

صدر مدرّس جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔......۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء

شیخ الحدیث جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور۔......۱۳۹۶ھ/۱۹۷۵ء

''تذکرۂ اکابر اہل سنت'' کی لاہور سے اولین اشاعت۔......۲۶ر رمضان ۱۳۹۶ھ/ ستمبر ۱۹۷۶ء

ولادت صاحبزادہ مشتاق احمد قادری۔......۴ر جون ۱۹۷۷ء

تیسرے بیٹے حافظ نثار احمد قادری کی ولادت۔......۱۰ر دسمبر ۱۹۷۸ء

''الحدیقۃ الندیۃ'' پر عربی مقدمہ لکھنے پر علامہ ارشد القادری کا خراج عقیدت۔مکتوب محررہ بنام مولانا محمد منشا تابش قصوری۔......۱۳ر فروری ۱۹۷۹ء

علامہ یوسف بن سماعیل نبہانی علیہ الرحمہ کی کتاب ''الشرف المؤبد'' کا اُردو ترجمہ ''برکاتِ آل رسول'' کیا جسے رضا پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔......۱۹۸۱ء

پہلی بار حج اور زیاراتِ مقدسہ کی سعادت حاصل ہوئی۔......۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء

خانوادۂ اعلیٰ حضرت سے مولانا ریحان رضا خاں سے اجازت وخلافت ملی۔......۵ر محرم ۱۴۰۲ھ/۱۹۸۲ء

غیر مقلدین کے ردّ میں لکھی گئی کتاب ''اندھیرے سے اُجالے تک'' کی مرکزی مجلس رضا، لاہور سے اشاعت۔......۱۹۸۵ء

غیر مقلدین کی انگریز نوازی کے بارے میں تحقیقی کتاب ''شیشے کے گھر'' کی مرکزی مجلس رضا لاہور سے اشاعت۔......۱۹۸۶ء

وفات والد ماجد مولوی اللہ دتہ۔......۱۹۸۹ء

کتاب ''ادلہ اھل السنہ والجماعہ'' مصنفہ سید یوسف ہاشم الرفاعی کے اُردو ترجمہ ''اسلامی عقائد''

کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۰ء

"اشعۃ اللمعات" (فارسی) جلد چہارم کے اُردو ترجمہ کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۰ء

ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی نے لاہور میں امام احمد رضا گولڈ میڈل پیش کیا۔......۱۹۹۱ء

جلال آباد (افغانستان) کا چار روزہ دورہ۔......۱۹۹۱ء

عرس مبارک امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ سرہند شریف (بھارت) میں شرکت (چھ روزہ دورہ)۔......۲۵/تا ۳۰/اگست ۱۹۹۲ء

سیرتِ پاک پر محررہ مقالات کے مجموعہ "مقالاتِ سیرتِ طیبہ" کی لاہور سے اشاعت......۱۹۹۳ء

علامہ شیخ محمد صالح فرفور (دمشق۔شام) کی کتاب "من نفحات الخلود" کا اُردو ترجمہ "زندہ جاوید خوشبوئیں" کیا اور مکتبہ قادریہ سے شائع کیا۔......۱۹۹۳ء

دوسری بار والد ماجد کی طرف سے حج بدل کیا، اس سال حج اکبر کی سعادت ملی۔......۱۹۹۴ء

"مدینۃ العلم" (عربی) اور "شہر یارِ علم" اردو کی رضا اکیڈمی لاہور سے یکجا اشاعت۔......۱۹۹۶ء

عربی کتاب "من عقائد اهل السنة" کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۶ء

کتاب "نور نور چہرے" کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۷ء

مرکز تحقیقات اسلامیہ لاہور کے صدر کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔......۱۹۹۷ء

"اشعۃ اللمعات" کے اردو ترجمہ کی جلد پنجم اور ششم کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۷ء

انٹرنیشنل امام ابوحنیفہ کانفرنس اسلام آباد میں عربی مقالہ "فی ظلال الفتاویٰ الرضویہ" پڑھا......۱۹۹۸ء

مقبول ترین عربی کتاب "من عقائد اهل السنة" کا اردو ترجمہ "عقائد ونظریات" کی لاہور سے طباعت۔......۱۹۹۹ء

مختلف سوانحی مقالات کے مجموعہ "عظمتوں کے پاسبان" کی لاہور سے اشاعت۔......۱۹۹۹ء

اس کے علاوہ کئی ایک کتابیں جن میں "تعارف فقہ وتصوف" (شیخ عبدالحق محدث دہلوی)، کشف النور عن اصحاب القبور (علامہ عبدالغنی نابلسی) کا اردو ترجمہ، "اصل مراد حاضری اُس پاک در کی ہے" (شیخ محمد سعید ممدوح۔دبئی) اردو ترجمہ اور امام محمد بن موسیٰ المزالی المراکشی کی عربی کتاب کا ترجمہ بنام "پکارو یارسول اللہ"، "الجز المفقود مصنف عبدالرزاق" کا اردو ترجمہ مکتبہ قادریہ سے شائع کیں۔

علامہ محمد عبدالحکیم شرف القادری طویل عرصہ سے شدید بیمار تھے، یکم ستمبر ۲۰۰۷ء بروز ہفتہ وصال فرمایا اور رات ۱۰ بجے دربار حضرت سیدی علی ہجویری داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ پر نمازِ جنازہ ادا کی گئی، جس میں ہزاروں علما ومشائخ اور عوام اہل سنّت نے شرکت کی۔ علامہ کو ان کی رہائش برکاتی منزل، چمن زار اسٹریٹ علی ٹاؤن بالمقابل ریگیلم سکول رائے ونڈ روڈ لاہور کے قریب سپرد خاک کیا گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون

ہم فکر رضا کے اراکین وعہدیداران، سوگواران کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ کریم مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

اس مضمون کی تیاری میں کتاب "محسن اہل سنت" از محمد عبدالستار طاہر "تذکار شرف" از محمد عبدالستار طاہر، پندرہ روزہ "فکر رضا" لاہور، یکم تا پندرہ ستمبر ۲۰۰۷ء سے استفادہ کیا گیا۔

☆......☆......☆......☆

مادہ ہائے سن وصال

حضرت علامہ مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

از: علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی

۱۴۲۸ھ

☆ طوبیٰ، ان المتقین فی جنت ونعیم

☆ غریقِ حُبِ حق

☆ بندۂ الٰہ، قادری رضوی

☆ عالم، محافظِ مسلکِ حق

☆ محبِ حکیم مولانا محمد عبدالحکیم شرف قادری

☆ علامہ، فہیم علومِ رضا

☆ وجودِ شرف، رحمۃ اللہ علیہ

☆ آں مجاہدِ مسلکِ حق اہل سنت و جماعت

☆ احوالِ شرف، ترجمانِ حق

۲۰۰۷ء

☆ تابع دین، ان اللہ عندہ اجر عظیم

☆ معلّمِ اسلام، ترجمانِ رضا

☆ جنید، عاشقِ اعلیٰ حضرت

☆ او، عاشقِ غوثِ پاک

☆ جلیل القدر سنّی حنفی قادری رضوی

نوٹ: حروف کے اعداد شمار کرنے میں کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔

مشکل کُشا

از: خلیل احمد رانا، پاکستان

کچھ عرصہ ہوا ملتان کے ایک بوڑھے نجدی غیر مقلد شیخ نور محمد، محلہ وزیر آباد، گلی نمبر۳، مکان نمبر۱۰۰۴ (ملتان شہر) نے ایک ورقی اشتہار بنام ''خدا کے سوا کوئی اور مشکل حل کرنے پر قادر ہے؟'' شائع کیا تھا، پھر یہ اشتہار غیر مقلدین نے اپنے رسائل وغیرہ میں شائع کرنے کے علاوہ کافی تعداد میں شائع کیا، اب انٹرنیٹ کے ذریعے اس کی اشاعت کی جارہی ہے، لہذا اس کے جواب کی اشاعت ضروری ہے۔

بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کو مشکل کشا نہیں کہنا چاہیے، مخلوق میں سے کسی کے لیے ایسا نام درست نہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو، کیونکہ اس سے شرک کا شبہ پڑتا ہے۔

عرض ہے کہ ''مشکل کشا'' ایسا نام نہیں کہ جس کا استعمال قرآن و حدیث میں اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص قرار دیا ہو اور دوسروں کے لیے ایسا نام استعمال کرنا شرک ہو، نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ یہ لفظ خالق و مخلوق دونوں پر بولا جاسکتا ہے، البتہ خالق کے لیے استعمال کرنے میں اس کے جو معنی ہوتے ہیں، مخلوق کے لیے وہ معنی مراد نہیں ہوتے، جس طرح رؤف، رحیم، کریم، سمیع، بصیر، مولیٰ وغیرہ متعدد الفاظ قرآن و حدیث میں خالق و مخلوق دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں مگر ہر جگہ معنی الگ الگ ہیں۔

معروف عالم دین مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی، سابق خطیب جامع مسجد چوک دالگراں، لاہور (روپڑی کی نسبت، قصبہ روپڑ، ضلع ہوشیار پور، مشرقی پنجاب، بھارت کی وجہ سے ہے) سے کسی صاحب نے سوال کیا کہ قرآن میں لفظ ''خلق'' کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بھی، اس کی وضاحت فرمائیں۔

تو اس سوال کے جواب میں حافظ ثناء اللہ صاحب مدنی نے ''لفظ خلق کی اضافت عابد و معبود دونوں کی طرف ہے، دونوں میں کیا فرق ہے؟'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، جس کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

> ''صفاتِ الٰہیہ میں سے بعض ایسی بھی ہیں جو بندوں اور خالق کے درمیان مشترک نظر آتی ہیں، مثلاً علم، سمع، بصر، رویت، یدا وغیرہ وغیرہ لیکن یہ اشتراک صرف ظاہری اور لفظی ہے ورنہ بندے کی طرف ان کی اضافت اس کے مناسب حال عجز کے اعتبار سے ہے اور خالقِ کائنات کی طرف ان کی نسبت اس کے کمال کے اعتبار سے ہے، قرآن

کریم میں لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر، اس جیسی کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سُنتا ہے(اور) انسان کے بارے میں ہے جعلنہ سمیعاً بصیرا تو ہم نے اس کو سُنتا دیکھتا بنایا"۔

(ہفت روزہ تنظیم اہل حدیث، لاہور، شمارہ ۱۵ر جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۵)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لقد جاء کم رسولٌ من انفسکم عزیزٌ علیه ما عنتم حریصٌ علیکم بالمومنین رء وف رحیم (سورۃ توبہ، آیت ۱۲۸)

انه لقول رسول کریم (سورۃ الحاقة، آیت ٤٠)

قرآن نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عزیز، رؤف، رحیم، کریم کہا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نام ہیں، اگر ان ناموں کے اشتراک سے شرک نہیں تو مشکل کشا کے نام سے شرک کیسے ہوگا؟

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قال ابراهیم ربی الذی یحی ویمیت قال انا اُحی و اُمیت

(سورۃ البقرہ، آیت ۲۵۸)

"جب کہ ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے تو نمرود بولا میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں"۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

انی اخلق لکم من الطین کھیئة الطیر فانفخ فیه فیکون طیرا باذن الله وابری الاکمه والابرص واحی الموتٰی باذن الله (سورۃ آل عمران، آیت ۴۹)

"میں تمہارے لیے بناتا ہوں مٹی سے پرندوں کی سی صورت پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہوجاتی ہے اور مادر زاد اندھے کوڑھی کو تندرست کردیتا ہوں اور اللہ کے حکم سے مردوں کو زندہ کردیتا ہوں"۔

موت وحیات دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے، نمرود نے موت وحیات دینے کی نسبت اپنی طرف کی تو یہ شرک ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مردوں کو زندہ کرنے کی نسبت عطائے الٰہی سے اپنی طرف کی جو عین ایمان ہے، اگر کوئی مومن حضور نبی کریم ﷺ کو باذن اللہ مشکل کشا مانے تو شرک کیسے ہوگا؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

ویضع عنهم اصرهم والاغلٰل التی کانت علیهم

(پ۹، سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۷)

ترجمہ: ''اور اُن کا بوجھ اُتارتے ہیں اور (دور کرتے ہیں ان سے) گلے کے طوق جو اُن پر تھے۔
یعنی آپ بندوں پر سے ان کے بھاری بوجھوں کو اور سخت تکلیفوں کے پھندوں کو اُتارتے ہیں۔
دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"کتٰبٌ انزلنٰه الیک لتخرج الناس من الظلمٰت الی النور"

(پ ۱۳، سورۃ ابراھیم، آیت ۱)

ترجمہ: (یہ) کتاب ہے ہم نے اسے آپ کی طرف نازل فرمایا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے اُجالے میں لائیں۔

ایمان سے کہیں کہ انسانوں کو ظلمت اور گمراہیوں سے نکال کر راہ ہدایت کی طرف لانا، یہ انسانوں کی مشکل کشائی نہیں تو اور کیا ہے؟ ان آیات میں انسانوں کو مشکل سے نکالنے کی نسبت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔

کیا اللہ کے سوا کوئی اور مشکل حل کرنے پر قادر ہے؟

سوال کی دس شکلیں

سوال نمبر۱: زید کو کسی مشکل کا سامنا ہے، وہ چاہتا ہے کہ میری مشکل دور ہو، وہ اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو پکارنا چاہتا ہے جو اس کی مشکل دور کردے، اب اگر اللہ کے سوا کوئی اور ہستی مشکل حل کرسکتی ہے تو بتایئے کہ سائل اور مشکل کشا کے درمیان ہزاروں میل کی دوری پر وہ زندگی میں یا زندگی کے بعد قبر میں آواز سن سکتا ہے؟

جواب: ہر مشکل میں مشکل کشا کو پکارا ہی نہیں جاتا، بلکہ قانون قدرت کا اتباع ضروری ہے، مثلاً زید کو بھوک یا پیاس یا بیماری کی مشکل کا سامنا ہے تو اللہ تعالیٰ نے ان مشکلات کا حل روٹی، پانی، دوائی کے سپرد فرمایا ہوا ہے، زید کو چاہیے کہ بسم اللہ شریف پڑھ کر ان چیزوں کو حسب قانون قدرت وشریعت استعمال کرے بمشیتہٖ تعالیٰ مشکل دور ہو جائے گی اور اگر بجائے استعمال کرنے کے ''یا روٹی، یا پانی، یا دوائی'' کہہ کر ان مشکل کشاؤں کو پکارتا ہے تو مجنون سمجھا جائے گا، بلکہ اگر ان کی موجودگی میں انہیں استعمال نہ کرے اور صرف مشکل کشائے حقیقی جل مجدہٗ کو ''یا اللہ، یارب'' کہہ کر پکارنا شروع کردے اور بھوکا پیاسا مرجائے تو حرام کی موت مرے گا، کیونکہ قانون قدرت سے منہ موڑنا جرم وگناہ ہے۔ اگرچہ ''یا اللہ'' کہنا عبادت ہے، اور اگر دوائی استعمال کرنے کے باوجود بیمار کو آرام نہ ملے اور وہ ''یا ارحم الراحمین'' کہہ کر مشکل کشائے حقیقی کو اور ''یا رسول اللہ'' (ﷺ) کہہ کر مشکل کشائے عطائی کو پکارے تو یہ طریقۂ علاج درست ہے اور اس سے صاحب نسبت اور خوش عقیدہ تندرست ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے "یا محمد" کہا تھا اور یکدم تندرست ہو گئے تھے۔ (طبقات ابن سعد، جلد۴، ص۱۵۴۔ الادب المفرد، از امام بخاری، اُردو ترجمہ، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۴۔ تحفۃ الذاکرین، از امام الوہابیہ محمد بن علی شوکانی، عربی، مطبوعہ بیروت، ص ۲۶۰)

حضور اقدس ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی قوت سماعت مرحمت فرمائی ہوئی ہے کہ ہزاروں نہیں لاکھوں کروڑوں میلوں کی دوری سے بھی آپ آواز سن سکتے ہیں۔

مادی ذرائع اور قوت سے تو عام انسان بھی پاکستان و ہندستان میں بیٹھا ہزاروں میل دور امریکہ میں بات کرنے والے کی آواز سن لیتا ہے، اور جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ روحانی قوت حاصل ہو، اُس کی قوت سماعت کا کیا اندازہ ہے، کیونکہ روحانیت کی طاقت مادیت سے زیادہ ہے، حضور نبی کریم ﷺ نے جنت میں اپنے صحابی "نعیم نحام" (جو کہ زمین پر تھے) کے کھانسنے کی آواز سن لی تھی، اسی بنا پر انہیں "نحام" یعنی کھانسنے والا کہا جاتا ہے۔ (طبقات ابن سعد، ج۴، ص ۱۳۸)

اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ کو ساری مخلوق کی آواز سننے کی قوت عطا فرما رکھی ہے۔ (جلاء الافہام، مطبوعہ، مصر، ص ۵۲)

حضور نبی کریم ﷺ کی حدیث ہے آپ نے فرمایا! "لیس من عبدی یصلی علی الا بلغنی صوتہ حیث کان قلنا وبعد وفاتک؟ قال: وبعد وفاتی، کوئی بندہ (کسی جگہ سے) مجھ پر درود نہیں پڑھتا مگر اس کی آواز مجھ تک پہنچ جاتی ہے وہ جہاں بھی ہو، (صحابہ نے) عرض کیا، حضور آپ کی وفات کے بعد بھی؟ فرمایا، ہاں! میری وفات کے بعد بھی۔ (جلاء الافہام، از امام الوہابیہ ابن قیم الجوزیہ، مطبوعہ قاہرہ، مصر، ص ۶۳)

ہزاروں میل کی دوری سے ہزاروں لاکھوں اُمتی ہر وقت درود شریف پڑھ رہے ہیں اور حضور ﷺ ان کا دُرود سُن رہے ہیں۔

سوال یہ تھا "بتایئے کہ سائل اور مشکل کشا کے درمیان ہزاروں میل کی دوری پر وہ زندگی میں یا زندگی کے بعد قبر میں آواز سن سکتا ہے؟ تو اس کا جواب مذکورہ حدیث شریف سے ہوگیا"۔

سوال نمبر۲: بالفرض یہ ثابت ہوجائے کہ وہ اتنے فاصلوں پر آواز سن سکتا ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ دنیا کی ہر زبان سے واقف ہے یا نہیں؟ مثلاً سرائیکی والا سرائیکی میں پیش کرے گا، اسی طرح جرمن والا جرمنی زبان میں، انگریز انگریزی میں اور پٹھان پشتو میں آواز دے گا۔

جواب: قرآن مجید شاہد ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو تمام زبانوں کا علم عطا فرمایا گیا تھا (سورۃ البقرہ، آیت ۳۱) اور حضور اقدس ﷺ کو ہر قسم کی بولنے والی سب قوموں کا نبی بنایا گیا ہے۔ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۵۸۔ سورۃ السبا، آیت ۲۸) اور یہ قانون قدرت ہے کہ نبی کو اس کی اُمت کی سب بولیاں

سکھائی جاتی ہیں (سورۃ ابراہیم، آیت ۴) بلکہ حضور اقدس ﷺ کی نبوت کے وسیع تر احاطہ میں حیوانات وبہائم اور تمام عالمین ارضی وسماوی داخل ہیں (سورۃ الفرقان، آیت ۱) تو ثابت ہوا کہ آپ ﷺ انسانوں کی سب بولیاں جانتے ہیں اور حیوانات کی بھی، بنابریں احادیث مبارکہ میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ حضور ﷺ کی خدمت میں چڑیوں، ہرنیوں، اونٹوں نے حاضر ہوکر اپنی اپنی بولیوں میں فریادیں کیں اور آپ نے سب کی بولیاں سمجھ کر سب کی مشکل کشائی فرمائی۔

سوال نمبر۳: اگر یہ بات بھی ثابت کردی جائے کہ وہ ہستی ہر زبان سے واقف ہے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ اگر ایک لمحہ میں سینکڑوں یا ہزاروں لوگ اپنی مشکل اس کے سامنے پیش کریں، تو کیا وہ ان سب کی مشکلات اسی لمحہ سُن اور سمجھ لے گا یا اس کے لیے قطار بنانے کی ضرورت پیش آئے گی؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے اولوالعزم پیغمبروں کو اپنے آپ پر قیاس کرنا بہت بڑی بدنصیبی ہے، ان کی قوت قدسیہ کا یہ عالم ہے کہ ان منگتوں کو قطار بنانے کی ضرورت پیش نہیں آتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے خزانوں سے لے کر اس کے حکم کے مطابق اس کی بخشی ہوئی قوت سے یک دم بھکاریوں کی مرادیں پوری کردینا ان کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ سائل اگر کور چشم نہیں تو ہر روز مشاہدہ کرتا ہوگا کہ سورج سے دنیائے عالم کا ہر ذرہ قطار بنائے بغیر روشنی حاصل کرتا رہتا ہے تو آفتاب نبوت ﷺ کا ساری اُمت کو بیک ساعت فیض پہنچانا سائل بدنصیب کو کس اصول کے تحت محال نظر آتا ہے۔ کیا سائل نے احادیثِ شفاعت نہیں پڑھیں یا نہیں سنیں؟ بروز محشر ساری کائنات براہ راست مشکل کشائے حقیقی اللہ تعالیٰ جل مجدہٗ کے حضور حاضر نہیں ہوگی بلکہ مشکل کشائے عطائی جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے آستانۂ رحمت پر جبینِ نیاز جھکائے گی اور آپ قطار میں کھڑا کرنے کے بغیر سب کی مشکل کشائی فرمائیں گے، اندازہ کرلو اُس وقت کتنی مخلوق ہوگی۔

سوال نمبر۴: کیا اس ہستی کو کبھی نیند بھی آتی ہے یا وہ ہمیشہ جاگتا رہتا ہے، اگر کبھی نیند آتی ہے تو پھر ہمارے پاس ایک لسٹ ہونی چاہیے کہ کب اس کو نیند آتی ہے اور کب وہ جاگ رہا ہوتا ہے تاکہ ہم اپنی مشکل صرف اسی وقت پیش کریں جب کہ وہ سو نہ رہا ہو، یا وہ نیند میں بھی سُنتا ہے؟

جواب: اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی نیند دوسروں کی بیداریوں سے ہزار درجہ بہتر ہے، اسی لیے حضرات انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام پر نیند میں بھی وحی اُترا کرتی ہے، یہ جو ہر سال ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ کو لاکھوں قربانیاں دی جاتی ہیں، یہ اسی وحی کا نتیجہ ہیں جو حضرت ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام پر نیند کی حالت میں اُتری تھی، اور یہ جو ہر مسجد میں ہر روز پانچ اذانیں دی جاتی ہیں، ان کا حکم بھی نیند ہی میں ملا تھا۔ (مشکوٰۃ، ص ۶۴)

بنابریں حضور اقدس ﷺ کی نیند ناقصِ وضو نہیں، کیونکہ نیند کی حالت میں بھی آپ کا قلب انور جاگتا رہتا ہے۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۰۶)

آپ ﷺ آرام فرما رہے تھے، حضرت بلال جاگ رہے تھے، ان کے پاس شیطان آیا، اس نے انہیں بچوں کی مانند تھپکیاں دے کر سُلا دیا، یہ سارا منظر آپ ﷺ نے نیند میں دیکھا اور تھپکیوں کی آواز سُنی پھر اُٹھ کر سب کچھ بیان فرما دیا۔ (مشکوٰۃ، ص ۶۰)

ایک دوسرا واقعہ ہے کہ آپ ﷺ کاشانۂ رحمت میں آرام فرما رہے تھے، حضرت ابوہریرہ مال زکوٰۃ کی حفاظت پر مامور تھے، تین شب لگاتار چور آتا رہا، ہر بار پکڑا جاتا رہا، پھر کچھ جھوٹ کچھ سچ بول کر چھوٹ جاتا رہا۔ آنحضرت ﷺ اس کی سب حرکتوں کو دیکھتے رہے اور اس کی سب باتوں کو سُنتے رہے، جتنا اس نے جھوٹ بولا تھا وہ بھی اور جتنا سچ کہا تھا وہ بھی آپ نے ابوہریرہ کو بتا دیا پھر فرمایا وہ چور شیطان تھا۔ (مشکوٰۃ، ص ۱۸۵)

سوال نمبر ۵: ایک شخص بولنے سے قاصر ہے وہ ایسی مشکل میں مبتلا ہے کہ گلہ بند ہو چکا ہے، اگر وہ دل ہی دل میں اپنی مشکل پیش کرے تو کیا وہ اس کی دلی فریاد بھی سُن لے گا؟

جواب: بے شک قرآن وحدیث گواہ ہیں کہ انبیا اور رُسل عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے سر کے کان زبان کی باتوں کو، اور دل کے کان دل کی فریادوں کو سن لیتے ہیں ملاحظہ ہو:

ا۔ فرشتے "ما تمکرون" کو یعنی لوگوں کی خفیہ تدبیروں کو لکھ لیتے ہیں جن کا تعلق دل ہی سے ہوتا ہے۔ (سورۃ یونس، آیت ۲۱)

۲۔ حضور اقدس ﷺ کو حکم دیا گیا کہ "جو لوگ اللہ کی رضا چاہتے ہیں ان سے اپنی جان مانوس رکھو، اور انہیں اپنے سے دور نہ کرو اور جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہیں ان کا کہا نہ مانو۔ (سورۃ الانعام، آیت ۵۲۔ سورۃ الکہف، آیت ۲۸) اللہ کی رضا دل ہی سے چاہی جاتی ہے، اور جو غافل دل کو نہ جانتا ہو، وہ اس سے بچ نہیں سکتا، معلوم ہوا کہ آپ دل کے ارادوں کو، دل کی غفلتوں کو جانتے ہیں تو ظاہر ہے دلی فریاد بھی سُن سکتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سب اعمال ملاحظہ فرماتے رہتے ہیں۔ (سورۃ توبہ، آیت ۹۴)، دل سے اچھی یا بُری نیت کی جائے تو وہ بھی اعمال میں داخل ہے، اس مضمون کی احادیث بے شمار ہیں مگر بنابریں اختصار آیات مبارکہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

سوال نمبر ۶: انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک چھوٹی بڑی تمام مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اگر وہ تمام مشکلات اللہ تعالیٰ حل کر سکتا ہے تو پھر غیر کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر غیر اللہ ان تمام مشکلات کو حل کرنے پر قادر ہے تو پھر اللہ کی کیا حاجت؟

جواب: سائل کی پیدائش سے پہلے اس کی والدہ نے اس کے والد کی طرف رجوع کیا، جو غیر اللہ ہے، پھر سائل نے شکم مادر میں پرورش پانے کے لیے خون حیض کی طرف رجوع کیا جو غیر اللہ ہے، پھر سائل کی پیدائش کے وقت اس کی والدہ نے لیڈی ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا، جو غیر اللہ ہے، پھر سائل نے

دو سال تک شیر مادر کی طرف رجوع کیا، جو غیر اللہ ہے، پھر آج تک سائل نے کھانے پینے، رہنے سہنے، پڑھنے، پہننے اوڑھنے کے سلسلہ میں علاج معالجہ، حجامت بنوانے وغیرہ لاکھوں مرتبہ غیر اللہ کی طرف رجوع کیا، پھر سائل جب مر جائے گا تو غسال اور گورکن کی طرف، کفن پہنانے، لاشہ اُٹھانے، دفنانے والوں کی طرف رجوع کرے گا، تعجب ہے کہ اس کثرت سے غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے والا علما سے پوچھتا ہے کہ "غیر کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے" خدا معلوم اس خیال کے لوگوں کی عقلیں کیوں ماری جاتی ہیں؟ سائل بے چارے کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اسباب کا بھی، مسببات کا بھی، اس لیے اس کی طرف ہر ایک کو ہر وقت احتیاج رہتی ہے اور اس نے اپنی حکمت سے ایک مخلوق کو دوسری کا محتاج بنا کر پیدا فرمایا ہے، اس لیے غیر کی طرف رجوع کی بھی ضرورت رہتی ہے، جو در حقیقت اُسی کی طرف رجوع ہے کیونکہ اسی نے یہ سلسلہ اسی طرح جاری فرمایا ہے (جل جلالہٗ)

سوال نمبر ۷: اگر غیر اللہ مشکل کشا تمام مشکلات حل کرنے پر قادر نہیں تو ہو سکتا ہے کہ کچھ مشکلات حل کرنے کا بیڑا خدا نے اُٹھایا ہو اور کچھ مشکلات حل کرنے کے اختیارات کسی غیر کو دے رکھے ہوں، ایسی صورت میں تو ہمارے پاس یہ فہرست ہونی چاہیے کہ کون کون سی مشکلات خدا تعالیٰ حل کرنے پر قادر ہے اور کون کون سی مشکلات غیر اللہ حل کر سکتا ہے تاکہ سائل اپنی مشکل اسی کے سامنے پیش کر سکے جو اس کے حل کرنے پر قادر ہو۔

جواب: ہر مشکل کو حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی حل فرماتا ہے، اس نے اپنی حکمت بالغہ کی بنا پر مخلوقات کو حل مشکلات کے لیے صرف ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہوا ہے۔ بھوک، پیاس، بیماری کی مشکلات کو اللہ تعالیٰ ہی حل فرماتا ہے، مگر اس نے روٹی پانی دوائی کو اس کے حل کا ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ سائل بھی قبض دور کرنے والی دوائی کو قبض کشا (دوسرے لفظوں میں مشکل کشا) ہی کہتا ہے۔ یونہی کفر و شرک، جہل و ضلال کی مشکلات کو اللہ تعالیٰ ہی دور فرماتا ہے مگر اس نے انبیا و مرسلین و اولیا و کاملین، علما ربانیین (علیہم السلام و رضی اللہ عنہم) کو ان مشکلات کے حل کا وسیلہ ارشاد فرمایا ہوا ہے، اسی طرح عذاب دنیا ہو یا عذاب آخرت، عذاب نار ہو یا عذاب زمہریر سب کو خدا تعالیٰ ہی دور فرماتا ہے، مگر اس نے ان عذابوں اور مشکلوں سے چھٹکارا پانے کے لیے مقبولین کی شفاعت کو وسیلہ قرار دیا ہوا ہے۔ امام احمد رضا خاں علیہ الرحمہ فرماتے ہیں!

مژدہ باد اے عاصیو! شافع شہ ابرار ہے   تہنیت اے مجرمو! ذات خدا غفار ہے

معلوم ہوا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جسے اللہ تعالیٰ حل نہ فرماتا ہو اور کوئی نبی ولی ایسے نہیں جنہیں حل مشکلات کا ذریعہ نہ بنایا گیا ہو۔

سوال نمبر ۸: کیا خدا کے سوا جو ہستی مشکل سے نکال سکتی ہے وہ مشکل میں ڈال بھی سکتی ہے یا اس

کی ڈیوٹی صرف حل کرنے پر ہے؟ اگر وہ مشکل حل کر سکتی ہے تو پھر ڈالنے والا کون ہے؟

جواب: حقیقت میں ہر مشکل ڈالتا بھی خدا ہے اور نکالتا بھی خدا ہے، جس طرح وہ اپنی مخلوق کے ذریعہ مشکلات دور فرماتا ہے یوں ہی اپنی بعض مخلوق کے ذریعہ مشکلات ڈالتا بھی ہے، اگر خدانخواستہ سانپ، بچھو وغیرہ موذی جانور اذیت پہنچائیں تو اس مشکل میں خدا ہی نے ڈالا ہے، یہ چیزیں صرف ذریعہ بنی ہیں، پھر اگر تریاق وغیرہ اس اذیت کو ختم کر دیں تو حقیقت میں یہ تکلیف خدا ہی نے دور کی ہے، تریاق وغیرہ صرف ذریعہ بنے ہیں، حضور اقدس ﷺ کی شان میں ابوجہل نے گستاخی کی تو اس کے دل پر کفر کی ابدی مہر لگ گئی، یہ مہر خدا ہی نے لگائی تھی، مگر حضور اقدس ﷺ کی گستاخی اس کا ذریعہ بنی اور حضرت ابوبکر صدیق نے غلامی مصطفےٰ ﷺ کا حق ادا کر دیا تو سب صحابہ پر فضیلت دیے گئے، یہ فضیلت انہیں اللہ تعالیٰ ہی نے بخشی، مگر حضور اقدس ﷺ کی نگاہ رحمت اس کا وسیلہ قرار پائی۔ (فالحمد لله علیٰ ذالك)

سوال نمبر ۹: بالآخر نتیجہ یہ نکلے گا کہ خدا تعالیٰ مشکلات ڈالنے والا ہے اور غیر اللہ مشکل حل کرنے والا، بالفرض ایک ہستی مشکل ڈالنے پر مصر ہو اور دوسری مشکل حل کرنے پر تو دونوں میں سے کون سی ہستی اپنا فیصلہ واپس لے لے گی؟

جواب: یہ تقسیم سائل کا اپنا اختراع ہے، اس کا کوئی مسلمان قائل ہے نہ کارخانہ قدرت میں اس کی کوئی گنجائش ہے، جیسا کہ سوال نمبر ۸ کے جواب میں بیان ہوا، سائل نے نہ خالق کی قدرت کو جانا، نہ مخلوق کی حیثیت کو پہچانا اور یونہی جہل مرکب کی وادی میں بھٹکتا پھر رہا ہے، حیرت ہے ان لوگوں پر جو اس جاہل کے سوالوں پر خوش ہیں۔

سوال نمبر ۱۰: کسی بھی برگزیدہ یا گنہگار ہستی کا جنازہ پڑھنا ہو تو اس کی بخشش کے لیے اللہ کو آواز دی جائے یا مشکل کشا کو؟

جواب: نماز جنازہ میں پست آواز کے ساتھ اللہ ہی کی بارگاہ میں طلب بخشش کی التجا کی جاتی ہے مگر دعا سے پہلے بارگاہِ اقدس ﷺ میں درود وسلام عرض کرنے کا حکم دیا گیا ہے تاکہ نماز جنازہ پڑھنے والے یقین کر لیں کہ مشکل کشا عطائی پیارے مصطفےٰ ﷺ کا نام لیے بغیر اور صلوٰۃ وسلام کا وسیلہ پیش کیے بغیر نہ نماز جنازہ قبول ہوتی ہے اور نہ کوئی مشکل آسان ہوتی ہے، اسی لیے قرآن مجید نے منافقوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے روکا ہے (سورۃ توبہ) کیونکہ منافق لوگ وسیلے کے بھی منکر ہوتے ہیں اور مصطفےٰ ﷺ کی طرف رجوع کرنے کے بھی، تو ان کی نماز جنازہ کا انہیں کچھ فائدہ نہیں ہوتا، سائل اس میں فرق نہ سمجھے تو یہ اس کی بددیانتی یا بے بصیرتی ہے۔ (والعیاذ باللہ تعالیٰ)

ٹائی کی حرمت وحلّت۔ ایک تحقیقی تجزیہ

از: محمد عبدالقادر رضوی امجدی
خادم دارالافتاء، جامع مسجد بانسی، ناگور شریف، راجستھان

ماہ نامہ 'جامِ نور' دہلی شمارہ فروری ۲۰۰۶ء میں حضرت مولانا ڈاکٹر غلام زرقانی صاحب کا مضمون "ٹائی کی شرعی حیثیت" شائع ہوا تھا۔ مضمون کو پڑھنے کے بعد اذہان وقلوب پر سکتہ طاری ہوگیا اور مولانا موصوف پر افسوس بھی ہوا......اس لیے کہ مولانا موصوف نے "ٹائی کی تاریخی حیثیت" پر گفتگو کرتے کرتے "ٹائی کی شرعی حیثیت" کی جانب بھی اپنے قلم کے رخ کو موڑدیا اور لباس کے حوالے سے ٹائی کے استعمال کو پوری دنیا کے لوگوں کے درمیان مروّج قرار دیا۔ جبکہ یہ بات خلاف حقیقت ہے۔ کیا مولانا موصوف نے پوری دنیا کا مشاہدہ فرمالیا ہے یا صرف عالمِ تخیلات وتصورات کی بات کرتے ہیں؟

مولانا تحریر کرتے ہیں: "یقین نہ آئے تو عالمِ تخیلات میں دنیا کے حدودِ اربعہ کی پہنائیاں ناپ لیں ہر چہار جانب لوگ اپنے گلے میں "ٹائی" آویزاں کیے نظر آئیں گے" اھ......نیز ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون کی تمہید میں مسئلہ تشبّہ بالنصاریٰ کو بالائے طاق رکھکر بڑی ہوشیاری سے پوری انسانیت میں ثقافتی اور تمدّنی اعتبار سے یکسانیت کو ثابت کیا ہے اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ "ٹائی اہلِ مغرب کی ایجاد ہے لیکن یہ سرے سے بے بنیاد، خلاف حقیقت اور تاریخی شواہد سے دانستہ طور پر منہ موڑنے کے مترادف ہے" اھ

تو اب ڈاکٹر صاحب ہی جواب دیں کہ ٹائی کس مسلمان نے ایجاد کی؟

ایک جگہ مولانا موصوف "ٹائی اور صلیب" کے عدم ربط پر لکھتے ہیں: "آپ دیکھ رہے ہیں! ٹائی کے رواج کے پس منظر میں "صلیب" کا ذکر کہیں نظر نہیں آتا۔ اس موضوع پر تاریخ چھان لیں "ٹائی" اور "صلیب" کے درمیان ادنیٰ سا ربط بھی آپ کو نہ ملے گا" اھ

تعجب ہوتا ہے مولانا موصوف پر کہ وہ صلیب کا ذکر تاریخ میں تلاش کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ قوم جو پوری دنیا کو ٹائی پہنا کر صلیب کا غلام بنانا چاہتی ہے وہ کس طور پر ٹائی کی تاریخ میں صلیب کا ذکر کرے گی۔ بلکہ وہ تو مسلمانوں کو ٹائی آویزاں کرنے کے لیے یہی تحریر کریں گے کہ "ٹائی کی ابتدا کس پس منظر میں ہوئی ہے یعنی (۱) ٹھنڈ سے خود کو بچانے کی ایک تدبیر کے طور پر (۲) فوجیوں کی گردنیں بلند کرکے انہیں بارعب بنانے کے لیے (۳) ریاست و مالداری کے اظہار کے طور پر (۴) کھلاڑیوں کا ظاہر چاق وچوبند دکھائی دینے کی غرض سے (۵) خالص طرزِ لباس کے طور پر" اھ......اس لیے اگر مولانا موصوف تاریخ کے بجائے ہمارے اجلہ اکابر کی تحریرات کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تو بہتر ہوتا اور کاش کہ حضرت مولانا بھی ان تحریرات کا مطالعہ فرمالیتے تو شاید قلم میں اس قدر آزادی پیدا نہ ہوتی......

جیسا کہ شہزادۂ اعلیٰ حضرت تاجدار اہل سنّت حضور مفتیٔ اعظم ہند قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں ''ٹائی لگانا نصاریٰ کے یہاں اُن کے عقیدۂ باطلہ میں یادگار ہے۔ حضرت سیدنا مسیح علیہ الصلوۃ والسلام کے سولی دیے جانے اور سارے نصاریٰ کا فدیہ ہوجانے کی۔ والعیاذ باللّٰہ تعالیٰ...... ہر نصرانی یوں ٹائی اپنے گلے میں ڈالے رہتا ہے...... ہر ٹوپ میں نشان صلیب رکھتا ہے جسے کراس مارک کہتا ہے۔ ٹائی کی طرح یہ کراس مارک بھی ردّ قرآن ہے۔ والعیاذ باللّٰہ تعالیٰ کہ قرآن فرماتا ہے۔ ''مَاقَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ' یہود نے نہ عیسیٰ مسیح کو قتل کیا نہ سولی دی'' اھ (فتاویٰ مصطفویہ، ص ۵۲۶)

ٹائی کی حرمت: مضمون کے آخر میں حضرت مولانا غلام زرقانی صاحب ''ٹائی کی تاریخی حیثیت'' بیان کر کے بعدۂ ارباب شریعت کی بارگاہ میں یوں عریضہ پیش کرتے ہیں: ''چونکہ میں اپنے آپ کو ''افتاء'' کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس لیے ٹائی کی شرعی حیثیت کے حوالے سے لب کشائی میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں اربابِ شریعت کی بارگاہ میں مؤدبانہ گذارش ضرور کروں گا کہ وہ ٹائی کی واقعی تاریخی حیثیت کی روشنی میں ازسرنو ٹائی کے استعمال پر اسلامی نقطۂ نگاہ واضح فرمائیں'' اھ۔ حضرت والا کی بارگاہ میں عرض کروں کہ ٹائی کی حرمت وحلت کے حوالے سے کیا مزید غور کرنے کی ضرورت پیش آگئی ہے؟ کسی شے کی تاریخی حیثیت کے پس منظر میں اس کی شرعی حیثیت پر کیا اثر واقع ہوتا ہے؟ اور شرع وتاریخ میں کون اصل وفرع ہے؟ کیا شرعی مسائل میں تاریخ کو منصوص ٹھہرایا گیا ہے؟......

جبکہ ٹائی کی حرمت کا حکم صادر فرما کر ہمارے ماضی قریب کے بزرگوں نے ''شعار نصاریٰ''، ''ردِ قرآن''، ''صلیب کی نقل'' ہونے کی تصریح فرمائی۔ جیسا کہ اعلیٰ حضرت مجدد اعظم قدس سرہ فرماتے ہیں ''سوال: زید کوٹ وکالر ونکٹائی پہنتا ہے؟ جواب: جو بات کفار یا بدمذہبان اشرار یا فساق یا فجار کا شعار ہو بغیر کسی حاجتِ صحیحہ کے برغبت نفس ...... اس کا اختیار مطلقاً ممنوع و ناجائز وگناہ ہے۔ اگرچہ وہ ایک ہی چیز ہو کہ اس سے اس وجہ خاص میں ضرور ان سے تشبہ ہوگا اسی قدر منع کو کافی ہے۔ اگرچہ دیگر وجوہ سے تشبہ نہ ہو۔ اس کی نظیر گلاب اور پیشاب ہیں۔ شیشہ بھرا ہوا گلاب اور اس میں ایک قطرہ پیشاب ہے تو وہ ناپاک وخراب ہے نہ کہ پورا شیشہ پیشاب ہو جبھی نجس وخراب ہو لہٰذا عموماً احادیث، ارشادات فقہ میں ہر ایسی پر حکمِ حرمت وممانعت دیا ہے۔ الاشباہ والنظائر میں ہے ''عبادہ الصنم کفرو کذالوتزنرا بزنار الیہود والنصاریٰ دخل کنیستھم اولم یدخل'' اھ (فتاویٰ رضویہ شریف جلد نہم، ص ۲۳۸، ص ۲۴۰)

اور حضور جانشینِ مفتیٔ اعظم تاجدار بریلی حضرت علامہ الحاج الشاہ مفتی محمد اختر رضا خان قادری اپنے فتوے میں تحریر فرماتے ہیں: ''ٹائی کی عیسائیوں کے یہاں اتنی اہمیت ہے کہ مردہ کو بھی ٹائی پہناتے ہیں تو ضرور یہ ان کا مذہبی شعار ہے جو مسلم کے لیے حرام اور باعثِ عار ونار ہے۔ مسلمانوں کو اس کی ہرگز اجازت نہیں ہوسکتی ...... ان کے اوپر لازم ہے کہ اس سے شدید احتراز کریں''۔ اھ (ٹائی کا مسئلہ ص ۶)

حضرت زرقانی صاحب! ٹائی کی تاریخ کیسی بھی ہو مگر یہاں حرمت کا سبب مذہبی شعار صلیب کی نقل آج بھی پایا جاتا ہے تو حکمِ حرمت بھی باقی رہے گا۔ اور علامہ مفتی اختر رضا صاحب قبلہ ازہری میاں کے فتوے پر جملہ اکابرینِ اہلِ سنّت نے تصدیق و تائید کے طور پر دستخط کیے ہیں۔ کیا ان حضرات کی عقابی نگاہ سے ''ٹائی کی تاریخی حیثیت'' پوشیدہ تھی؟ اور کیا تاریخی حیثیت معلوم ہونے کے بعد ٹائی کی حرمت کو حلّت میں بدلا جاسکتا ہے؟ اُن اجلہ مقتدر علما و مفتیانِ عظام کے اسما یہ ہیں: شارح بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی، مفتی غلام محمد ناگ پوری، آپ کے والد بزگوار قائدِ اہلِ سنّت علامہ ارشد القادری، مفتی جیش محمد صدیقی نیپال، صدرالعلما علامہ تحسین رضا خاں بریلوی، شیخ الحدیث علامہ سید محمد عارف رضوی، حضرت مفتی قاضی عبدالرحیم بستوی، حضرت مفتی محمد احمد جہانگیر صاحب بریلوی، حضرت علامہ محمد صالح قادری بریلوی، حضرت علامہ بہاء المصطفیٰ قادری، حضرت علامہ قمر الزماں اعظمی جنرل سیکریٹری ورلڈ اسلامک مشن لندن، ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، حضرت علامہ سید ظہیر احمد زیدی، حضرت علامہ مفتی ولی محمد باسنی، حضرت علامہ مفتی محمد مطیع الرحمٰن رضوی وغیرہم تقریباً چالیس ۴۰ مفتیانِ کرام نے ''الجواب صحیح'' فرمایا۔ تو پتہ چلا ان تمام مفتیانِ کرام نے بھی ٹائی کے استعمال کو حرام فرمایا۔ ان کے علاوہ ہندو پاک کے باوقار و محتاط علمائے کرام و مفتیانِ عظام تمام دارالافتاء سے ٹائی کے متعلق حرمت کا فتویٰ دیتے ہیں اور میری نگاہ میں کسی نے بھی جواز کا قول نہیں کیا۔ اگر آپ کی نظر سے گذرا ہو تو مطلع کریں، کرم ہوگا۔

تاریخ ٹائی کا فریب: ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحریر میں چند انگریزی کتابوں کو ماخذ بنایا ہے۔ ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب قبلہ نے "History of the Tie" کے حوالے سے لکھا ہے: ''ترجمہ: عہد حاضر میں ٹائی کے استعمال کا بنیادی مقصد سادہ تجارتی لباس کو مزید باوقار اور پُرکشش بنانا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ٹائی کا ابتدائی استعمال بھی پہننے والے کو اسی طرح جاذب نظر بنانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔'' اھ

مگر ایسا ہرگز نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کو دھوکہ میں مبتلا کرنا ہے۔ اس طور پر نہ ٹائی پہنی جاتی ہے اور نہ ہی پہلے کبھی اس بنیاد پر استعمال ہوتا تھا۔ بلکہ آج بھی ٹائی عیسائیوں کی پہچان اور خاص ان کا شعار ہے اس پر مومن و کافر سب متفق ہیں۔ جیسا کہ علامہ ازہری میاں قبلہ اپنا مشاہداتی بیان یوں تحریر فرماتے ہیں: ''ٹائی شعار نصاریٰ ہونے پر بذاتِ خود شاہد عدل ہے تو اب اس کے ہوتے مزید کسی شہادت کی ضرورت نہیں اور کسی شاذ و نادر کا انکار اصلاً معتبر نہیں، تاہم اس پر مومن و کافر سب متفق ہیں کہ یہ نصرانیت کا شعار ہے جیسا کہ بارہا متعدد لوگوں سے استفسار پر ظاہر ہوا...... ابھی پچھلے سال کی بات ہے کہ ڈربن (افریقہ) میں ایک نومسلم (سابق عیسائی) نے بتایا کہ ''ٹائی کو چرچ کی عزت کا لباس تصور کیا جاتا ہے جس سے اس کی مذہبی حیثیت معلوم ہوتی ہے۔ نیز ایک پاکستانی عالم سے ایک پادری نے کہا کہ ٹائی باندھنے سے ان کے بطور ثواب بڑھ جاتا ہے''۔ اھ (ٹائی کا مسئلہ، ص ۷)

اتنی صاف ستھری وضاحت ہونے کے بعد بھی کیا کوئی عقل مند اس بات کا مدعی ہوسکتا ہے کہ ٹائی لباس کو جاذبِ نظر بنانے اور سادہ تجارتی لباس کو باوقار بنانے کے مقصد سے لگائی جاتی ہے۔ بلکہ یہ تو پوری قومِ عیسائیت اور تاریخ ٹائی لکھنے والے کا کھلا ہوا فریب ہے۔ مولائے قدیر ہم سب کو یہود و نصاریٰ کی فریب کاری سے محفوظ و مامون رکھے نیز اُن کے شعار اور ان کی تہذیب و ثقافت سے دوری عطا فرما کر اسوۂ رسول اکرم ﷺ پر زندگی گزارنے کی توفیق بخشے۔ آمین بجاہ سید المرسلین وعلیٰ الہ واصحابہ اجمعین۔

OOOOO

رؤیتِ ہلال کا مجرّب و آسان فارمولا

تلاش: خلیل احمد رانا

قمری مہینوں کے آغاز کا انحصار رویت ہلال پر ہے، اگر قمری مہینے کی ۲۹؍تاریخ کی شام کو چاند نظر آجائے تو اگلے دن نئے مہینے کی یکم تاریخ ہوگی، ورنہ اُسی پچھلے مہینے کی ۳۰؍تاریخ ہوگی، کیونکہ قمری مہینہ ۲۹؍یا ۳۰؍کا ہوتا ہے، ۲۸؍یا ۳۱؍کا نہیں ہوتا، تاہم ایک استقرائی قاعدہ یہ بھی ہے کہ سالِ رواں کے محرم کے پہلے سات دنوں کو سامنے رکھتے ہوئے درج ذیل خاکہ سے مطلوبہ قمری مہینے کی یکم تاریخ معلوم کی جاسکتی ہے۔

مثلاً

- یکم صفر اس دن ہوگی جس دن رواں سال کے محرم کی تیسری تاریخ تھی۔
- یکم ربیع الاوّل اس دن ہوگی جس دن محرم کی چوتھی تاریخ تھی۔
- یکم ربیع الآخر اس دن ہوگی جس دن محرم کی چھٹی تاریخ تھی۔
- یکم جمادی الاولیٰ اس دن ہوگی جس دن محرم کی ساتویں تاریخ تھی۔
- یکم جمادی الاخریٰ اس دن ہوگی جس دن محرم کی دوسری تاریخ تھی۔
- یکم رجب اس دن ہوگی جس دن محرم کی تیسری تاریخ تھی۔
- یکم شعبان اس دن ہوگی جس دن محرم کی چوتھی تاریخ تھی۔
- یکم رمضان اس دن ہوگی جس دن محرم کی چھٹی تاریخ تھی۔
- یکم شوال اس دن ہوگی جس دن محرم کی ساتویں تاریخ تھی۔
- یکم ذیقعدہ اس دن ہوگی جس دن محرم کی چوتھی تاریخ تھی۔
- یکم ذی الحجہ اس دن ہوگی جس دن محرم کی چوتھی تاریخ تھی۔
- آئندہ سال یکم محرم اس دن ہوگی جس دن سال رواں کے محرم کی پانچ تاریخ تھی۔

آزمائیے اور دیکھیے

امام احمد رضا۔ علما، مفکّرین اور دانش وروں کی نظر میں

از: شبنم خاتون (ریسرچ اسکالر)
بنارس ہندو یونی ورسٹی، وارانسی، یوپی

امام احمد رضا خان بریلوی جو عالم، فقیہ، شاعر، ادیب اور مفکر کی حیثیت سے دنیاے اسلام میں مشہور ہیں۔ جن کی عبقری شخصیت نے مداحوں کے علاوہ مخالفین کو بھی متوجہ کیا اور ان سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ اہل علم وفضل کی قدر علم وفضل والا ہی جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمی حلقوں میں چاہے وہ عرب ہو یا عجم، ہر جگہ احمد رضا بریلوی کے علم وفضل کی دھوم رہی ہے۔ بریلی کی سرزمین پر ایک ایسا نابغۂ روزگار فقیہ الاسلام، مبلّغ اور مفکر پیدا ہوا جس کا مختلف مسلک کے لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ واقعی وہ شخصیت بحر العلوم اور بحر ذخار تھی۔ فاضلِ بریلوی کے جن سے نظریاتی اختلافات تھے وہ بھی علامہ کے لیے اچھے تاثرات رکھتے تھے۔ جیسے محمد علی جوہر اور احمد رضا بریلوی میں تحریک خلافت کے سلسلے میں نظریاتی اختلاف تھا۔ باوجود اس کے محمد علی جوہر نے "اخبار خلافت" (شمارہ، ۱۷ دسمبر 1919ء، ص ۱۷، ممبئی) میں بقول مولانا اسد نظامی اچھے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔

اپنے اس مقالہ میں ہم احمد رضا بریلوی کے مختلف کتب مثلاً **الدولة المكيه بالمادة الغيبيه، حسام الحرمين على منحر الكفر والمين** اور **كفل الفقيه الفاهم فى احكام قرطاس الدراهم** جیسے جلیل القدر رسالے پر علماے حرمین شریفین نے جو تصدیقات وتقریظات تحریر فرمائے ہیں ان میں کچھ منتخب تصدیقات وتقریظات کے اقتباسات پیش کریں گے۔ جس سے بخوبی یہ اندازہ ہوجائے گا کہ علماے حرمین شریفین کی نظر میں احمد رضا بریلوی کی کیا قدر ومنزلت تھی اور مولانا کی علمیت، فقاہت اور روحانی عظمت سے عرب وعجم کے بیشتر علما کس قدر متاثر تھے۔

علماے حرمین شریفین کے تاثرات کے بعد ہند وپاک کے کچھ نامور علما، مفکرین اور دانش وروں کے تاثرات کو بھی قلم بند کریں گے۔ قابلِ تعریف بات تو یہ ہے کہ ہر مسلک اور ہر فرقہ کے لوگوں نے اس بات کا بخوبی اعتراف کیا کہ واقعی وہ شخصیت بحر العلوم تھی اور فقۂ حنفی میں تو ان کا جواب نہیں۔

عرب

حضرت مولانا عبدالکریم مہاجر مکی

مدینہ شریف میں احمد رضا بریلوی کو جو قدر ومنزلت اور اعزاز واکرام حاصل ہوا اس کا آنکھوں

دیکھا حال مولانا عبدالکریم مہاجر مکی نے بیان کیا۔ وہ اپنے ذاتی تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''انی مقیم بالمدینة الامنیة منذ سنین ویاتیها من الهند الوف من العالمین. فیهم علماء و صلحاء و اتقیاء رأیتهم یدورون فی سکک البلد لا یلتفت الیهم من اهله احد واری العلماء الکبار العظماء الیک مهرعین وباجلالک مسرعین ذالک فضل الله یوتیه من یشآ او الله ذوالفضل العظیم۔'' ......[1]

ترجمہ تلخیص: مَیں کئی سال سے مدینہ منورہ میں مقیم ہوں، ہندستان سے ہزاروں صاحب علم آتے ہیں ان میں علما، صلحا، اتقیا سب ہی ہوتے ہیں، مَیں نے دیکھا کہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں مارے، مارے پھرتے ہیں اور کوئی بھی ان کو مڑکر نہیں دیکھتا۔ لیکن فاضلِ بریلوی کی عجب شان ہے۔ یہاں کے علما اور بزرگ سب ہی اُن کی طرف جوق در جوق چلے آرہے ہیں اور ان کی تعظیم میں بصد تعجیل کوشاں ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل خاص ہے جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے۔

مولانا سید مامون البری المدنی علیہ الرحمۃ

سید مامون المدنی علیہ الرحمۃ اپنے مکتوب (محررہ محرم الحرام ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) میں علامہ بریلوی کے اوصاف کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بسم الله الرحمن الرحیم الحمد لله والصلوٰة علی رسول الله الیٰ الاستاذ العلامة البارع الملاذ الفهامة اللامع، صاحب القلم السمای والکلم الفائق لطفها نعیم الاسمای، ذاالکمالات العالیة التی لا تنصوی کنهها برسم وحد، فهو الحقیق بان یقال انه فی عصره احدا، کیف و فضله اشهر من نار علی علم، والمنبر علی عالی همه عند الامم...... اعنی به حضرة الجناب المکرم والمحترم وحیدا لاوان الشیخ سیدی احمد رضا خان ابقر الله عزة وجلاله عن الزوال مامون و عن آفات الدهر مصوٗنا آمین بجاه سیّدالمرسلین ﷺ." ......[2]

ترجمہ: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الحمدللہ والصلوٰۃ علیٰ رسول اللہ بنام نامی استاذ العلامہ جو شیریں بیان، خوش فکر، روشن ضمیر اور صاحب تقریر وتحریر ہیں۔ ان کی حلاوت بیان شب خیز واعظین کی تاثیر رکھتی ہے۔ ان کی تحریریں بلند کمالات کی آئینہ دار ہیں، بادی النظر میں ہم ان کے کمالاتِ عالیہ کے حقائق کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ حقیقت میں یوں کہنا چاہیے کہ موصوف اپنے زمانے میں یکتا ہیں اور اُن کا علم وفضل مشہور ہے اور وہ اقوام کے نزدیک اپنی عالی ہمتی کی وجہ سے معروف ہیں۔ (کون؟) اس سے میرا اشارہ حضرت جناب مکرم ومحترم یکتائے روزگار، سیدی احمد رضا خاں کی طرف ہے۔ اللہ عزوجل سید المرسلین ﷺ کے طفیل انہیں

زوال و نکبت اور آفات زمانہ سے بچائے رکھے۔ (آمین)

شیخ محمد مختار بن عطارد الجاوی

مسجد حرام، مکہ معظمہ

''وان المؤلف من سلطان العلماء المحققين فی هذا الزمان وان کلامه کله حق صراح فکانه من المعجزات نبینا صلی الله تعالیٰ علیه وسلّم اظهر الله تعالٰی علی یدھذٰ الامام الا وحدا سیدنا و مولانا خاتمة المحققین وعمدة العلماء السُّنّیین سیّدی احمد رضا خان متعنا الله ببقائه وحماه من جمیع من اراد به سوء.'' ......؎

ترجمہ: بے شک مؤلف (مولانا احمد رضا خاں) اس زمانہ میں علمائے محققین کا بادشاہ ہے اور اس کی ساری باتیں سچی ہیں گویا وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کے معجزات میں سے ایک معجزہ ہے جو اس یگانہ امام کے دست مبارک پر حق تعالیٰ نے ظاہر فرمایا ہے (یعنی) ہمارے سردار، ہمارے آقا، علمائے محققین کے خاتم، علمائے اہل سُنّت کے پیشوا سیدی احمد رضا خاں، اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی زندگی سے متمتع فرمائے اور ان سب کے خلاف اس کی حمایت فرمائے جو اس کی بدخواہی کا ارادہ رکھتے ہوں۔

شیخ علی بن حسین مالکی علیہ الرحمہ

(مدرّس مسجد الحرام، مکہ مکرمہ)

''لمّا منّ الله علی باستجلاء نور شمس العرفان من سماء صفاء ملتزم الاتقان من صار محمود فعله، کشاف ایات فضله و کیف لا وهو مرکز دائرة المعارف الیوم، ومطلع کواکب سماء العلوم فی دارالقوم، عضد الموحدین وعصام المهتدین، القاطع بصارم البراهین، لسان المضلین الملحدین والرافع منارالایمان حضرة المولیٰ احمد رضا خاں۔'' ......؎

ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ نے مجھ پر احسان فرمایا اور آسمانِ صفاء کے آفتابِ عرفان کی روشنی سے میرے قلب کو منور فرمایا وہ جس کے افعالِ حمیدہ اس کے آثار فضیلت کے آئینہ دار ہیں، ایسا کیوں نہ ہو آج وہ دائرۂ معارف کا مرکز ہے، (اس کا وجودِ مسعود) ملّتِ اسلامیہ کے گھر میں آسمانِ علم و عرفان کے جھلملاتے تاروں کا مطلع ہے، وہ مسلمانوں کا یار و مددگار ہے، ہدایت یابوں کا نگہبان و نگران، گمراہوں اور ملحدوں کی زبانوں کو اپنے دلائل و براہین کی تلوار سے کاٹ پھینکتا ہے۔ ایمان کے منارے کو بلند سے بلند تر کرتا ہے (کون؟) ہمارے آقا احمد رضا خان۔

شیخ احمد ابوالخیر بن عبداللہ میرداد علیہ الرحمہ
(خطیب مسجد حرام، مکہ معظمہ)

"فهو كنز الدقائق المنتخب من خزائن الذخيرة، وشمس المعارف المشرقة في الظهيرة، كشاف مشكلات العلوم في الباطن والظاهر، يحق لكل من وقف على فضله ان يقول كم ترك الاوّل للاخر.

واني وان كنت الاخير زمانة لأت بمالم تستطعه الاوائل

وليس على الله بمستنكر ان يجمع العالم في واحد. ۵

ترجمہ: پس وہ حقائق کا خزانہ ہے اور محفوظ خزانوں کا انتخاب، معرفت کا آفتاب جو دوپہر کو چمکتا ہے، علوم کی ظاہر و باطن مشکلات کھولنے والا، جو شخص اس کے علم و فضل سے واقف ہوجائے اس کو کہنا چاہیے کہ اگلے پچھلوں کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں۔

دنیا میں اگرچہ میں آخری زمانہ میں آیا ہوں
لیکن وہ کچھ لایا ہوں جو اگلوں کو بھی میسر نہ تھا
خدا کی قدرتِ کاملہ سے بعید نہیں کہ وہ
شخصِ واحد میں عالم کی تمام خوبیاں موجود کردے

شیخ عبدالرحمٰن دھان مکی

"الذي شهد له علماء البلدالحرام، بانه السّيد الفرد الامام، سيّدي و ملاذي الشيخ احمد رضا خان البريلوى متعنا الله بحياته والمسلمين، و منحنى هديه، فان هديه هدى سيّد المرسلين." ۶

ترجمہ: وہ جس کے متعلق مکہ معظمہ کے علمائے کرام گواہی دے رہے ہیں کہ وہ سرداروں میں یکتا و یگانہ ہے، امامِ وقت، میرے سردار، میری جائے پناہ، حضرت احمد رضا بریلوی۔ اللہ تعالیٰ ہم کو اور سب مسلمانوں کو اس کی زندگی سے بہرہ ور فرمائے اور مجھے اس کی روش نصیب کرے کہ اس کی روش سیّد عالم ﷺ ہی کی روش ہے۔

سید حسین بن علامہ سیّد عبدالقادر طرابلسی علیہ الرحمہ
مدرّس مسجد نبوی۔ مدینہ منورہ

"امّا بعد لما ان منّ الله على عبيده بالتشرف باعتاب العلامة النحرير والفهامة الشهير حامى الملة المحمدية الطاهرة و مجدد المائة الحاضرة استاذى و

قدوتی مولانا الشیخ احمد رضا خاں۔" ۷

ترجمہ: بعد حمد ونعت کے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے چھوٹے سے بندے پر یہ احسان فرمایا کہ مَیں ان کے آستانے سے شرف یاب ہوا، جو علامہ ماہر کامل اور فہامہ مشہور ہیں۔ حامیِ ملتِ محمدیہ طاہرۂ مجدد مائتہ حاضر، میرے استاد اور میرے پیشوا حضرت مولانا احمد رضا خاں۔

شیخ عمر بن حمدان محرسی مالکی اشعر علیہ الرحمہ

مدینہ منورہ

"فانی قد اطلعت علی ما حررہ العالم، العلامة، الدراکة الفهامة ذو التحقیق الباهر، جناب الشیخ احمد رضا خان فی الخلاصة الماخوذة کتابه المسمّٰی المعتمد المستند فوجدته فی غایة التحریر فللّٰه در مؤلفه." ۸

ترجمہ: جناب شیخ احمد رضا خان نے جو اپنے خلاصہ میں تحریر فرمایا ہے مَیں نے اس کو مطالعہ کیا۔ یہ خلاصہ ان کی کتاب موسومہ المعتمد المستند سے ماخوذ ہے۔ (مطالعہ کے بعد) مَیں نے محسوس کیا کہ مصنف نے تحقیق کا حق ادا کر دیا۔ مصنف کی تعریف وتوصیف اللہ کے لیے ہے۔ وہ مصنف جو خوب ہی جاننے والا ہے، خوب ہی سمجھنے والا ہے اور ایسی روشن تحقیق کرنے والا جس سے تمام پہلو منور ہو جائیں۔

شیخ اسعد بن احمد دھان علیہ الرحمہ

مدرّس حرم شریف۔ مکہ معظمہ

"فقد اطلعت علی هذه الرسالة الجلیلة التی الّفها نادرة الزمان، ونتیجة الاوان، العلامة الذی افتخرت به الاواخر علی الاوائل والفهامة الذی ترک تبیانه سحبان باقل، سیّدی و سندی الشیخ احمد رضا خاں بریلوی۔" ۹

ترجمہ: یہ عظمت والا رسالہ میرے علم میں آیا جس کا مصنف نادرِ روزگار اور خلاصۂ لیل ونہار ہے۔ وہ علامہ جس کی وجہ سے پچھلے اگلوں پر فخر کرتے ہیں۔ جلیل فہم والا جس نے اپنے بیانِ روشن سے سحبان فصیح البیان کو بے زبان کر دیا، میرا سردار، میری سَند حضرت احمد رضا خاں بریلوی۔

مفتی شافعیہ شیخ سید احمد علوی بن سید احمد بافقیہ حسنی علوی علیہ الرحمہ

مدینہ منورہ

افضل الفضلاء، انبل النبلاء، فخر السلف، قدوة الخلف الشیخ احمد رضا خان البریلوی عامله اللّٰه بلطفه الحنفی۔" ۱۰

ترجمہ: فاضلوں سے افضل، سب عاقلوں سے زیادہ دانش مند، اگلوں کا فخر، پچھلوں کا پیشوا، حضرت احمد رضا خاں بریلوی۔ اللہ تعالیٰ اپنے پوشیدہ لطف سے اس کے ساتھ معاملہ کرے۔

ہندستان

ڈاکٹر حامد علی خان

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

''آپ ہی جیسے ستودہ صفات سے متصف انسان کے لیے بجا طور پر شاعر مشرق علامہ اقبال کا یہ شعر پڑھا جاسکتا ہے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ اپنی متنوع حیثیات سے منفرد تھے۔ آپ کی ہستی کو صفاتِ حسنہ کی جامع شخصیت کہا جاسکتا ہے۔ لہٰذا آپ کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے کا ارادہ کوئی معمولی کام نہیں۔ اگر آپ کے حالاتِ زندگی، مشاغلِ حیات اور علمی کارناموں وغیرہ پر کوئی اکیڈمی لگن کے ساتھ کام کرے تو تحقیق کا کچھ حق ادا ہوسکتا ہے۔''......[۱۱]

ڈاکٹر وحید اشرف

بڑودہ یونی ورسٹی

ڈاکٹر وحید اشرف نے ''امام احمد رضا کی اردو، فارسی شاعری'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ اس مقالہ میں ایک جگہ علامہ بریلوی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک ایسا شخص جس نے معقولات و منقولات کی اکثر اصناف میں اپنی بلندیِ فکر، جودتِ ذہن اور ندرت و جدّت کا ثبوت دیا ہو اور جن کی تصانیف سینکڑوں کی تعداد میں پہنچتی ہوں، اس سے یہ ظاہر ہے کہ وہ شاعری کے نازک فن سے بھی پوری طرح عہدہ برآ ہوسکتا ہے، عجائبات میں سے ہے۔ ایسی صرف ایک شخصیت اور نظر آتی ہے جس نے علومِ معقولات میں زندگی گزارنے کے باوجود شاعری کا ایک باکمال نمونہ چھوڑا ہے۔ اگرچہ ضخامت کے اعتبار سے بہت ہی کم ہے اور وہ ہے عمر خیام، جس کی رباعیات، فن اور فکر کا مکمل نمونہ ہیں۔ لیکن امام احمد رضا کے حالات اور ان کے علمی کارناموں کا جائزہ لیا جائے تو ان کے مقابل عمر خیام کو نہیں لیا جاسکتا ہے۔''......[۱۲]

ڈاکٹر نسیم قریشی

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر صاحب نے "قبلۂ اہلِ دل" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور احمد رضا خاں کے مشہور سلام "مصطفیٰ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام" کو پڑھ کر آپ کی طبیعت پر جو وجدانی کیفیت طاری ہوئی اس کو نہایت ہی دل نشیں انداز میں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"طبیعت بے اختیار وجد کر اُٹھی، ذہن کے دریچے، بہار ابد کی جاں فزا ہواؤں کے لیے کھل گئے۔ وجود کا ذرہ ذرہ سحابِ سرمدی کی سرشاریوں میں ڈوب گیا۔ کیا نغمہ! کیا نظم! کیا والہانہ سلام، لفظ و بیان کے پیچ خم ہیں۔ معنی ہے کہ حسنِ عقیدت میں سمو کر زمزمۂ داؤدی کے پیکر میں ڈھل گیا ہے۔ سرورِ کائنات کے حضور شرفِ باریابی حاصل ہے۔ نوائے شوق، نغمۂ والہانہ بن گئی ہے۔ ذوقِ فدائیت شباب پر ہے۔ شیفتگی و نیاز کیشی، ہمہ آواز، ہمہ سرورِ مستانہ، ہمہ ارتعاش، قلبِ مضطر ہوگیا۔ روحانی سرمستی کے عالم میں حضرت رضا خلد آشیانی کی زبانِ حقیقت ترجمان سے جو لفظ نکلا ہے، باغ کامرانی کا سدا بہار پھول بن گیا ہے۔"......۱۳

ڈاکٹر فیضان اللہ قادری

ریڈر شعبۂ عربی۔ جواہر لال نہرو یونی ورسٹی

ڈاکٹر فیضان اللہ فاروقی کا ایک تحقیقی مقالہ "ثقافۃ الہند" (آزاد بھون، نئی دہلی) سے قسط وار شائع ہوا۔ اس میں ڈاکٹر فیضان صاحب نے احمد رضا بریلوی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار ان لفظوں میں کیا ہے:

"میں نے مولانا احمد رضا خاں کی تصانیف اور تالیفات کو غور سے پڑھا ہے اور میرے مقالے میں اس عظیم شخصیت پر کافی کام موجود ہے۔ مولانا بریلوی کا فقہی تبحر اور منقولات و معقولات میں یکساں مہارت اور اس کا حسین امتزاج جتنا ان کے یہاں ہے ان کی نظیر معاصرین میں نہیں ملتی ہے۔ میں تو خود ان کے علم و فضل کا معترف ہوں۔"......۱۴

سید شاہ آلِ رسول مارہروی

حضرت مخدوم شاہ آلِ رسول مارہروی کا شمار تیرھویں صدی ہجری کے اکابر اولیا میں سے ہوتا ہے۔ آپ کی شخصیت جامع الکمالات تھی۔ بڑے بڑے علما اور فضلا نے آپ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا۔ احمد رضا بریلوی کے آپ پیر و مرشد تھے۔ احمد رضا جیسی شخصیت سے آپ بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے آپ

نے فرمایا:

"مجھے مدّت سے ایک فکر پریشان کیے ہوئی تھی۔ بحمد اللہ تعالیٰ وہ آج دور ہوگئی۔ قیامت میں جب اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ اے آلِ رسول ہمارے لیے کیا لایا ہے؟ تو مَیں اپنے مولوی احمد رضا کو پیش کردونگا۔"......۱۵

مولانا انور شاہ کشمیری

"مولوی احمد رضا خاں صاحب ہندوستان کے بڑے عالم تھے۔ اُن کا اخیر وقت ایک مُردہ سُنّت (اذان بین یدلہ خارج مسجد) کے احیا میں گزرا۔"......۱۶

مولوی اشرف علی تھانوی

"رشید احمد گنگوہی "فقیہ النفس" تھے۔ ایسا فقیہ النفس عالم بھی فاضلِ بریلوی کے پروازِ فکر کے سامنے عاجز نظر آتا ہے۔"......۱۷

"وہ ہندوستان کا فقیہ اعظم تھا۔ اُن کی وفات سے فقہ کو نقصان پہنچا۔"......۱۸

صاحب نزھۃ الخواطر مولوی عبدالحئی فرنگی محلی

"یندر نظیرہ فی عصرہ فی الاطلاع علی الفقہ الحنفی و جزئیاتہ یشھد بذالک مجموع فتاواہ و کتابہ "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" الذی الفہ فی مکۃ سنۃ ثلاث و عشرین و ثلاث ماۃ و الف۔"......۱۹

ترجمہ: فقۂ حنفی اور اُس کی جزئیات پر مولانا احمد رضا کو جو عبور حاصل ہے اس کی نظیر شاید ہی کہیں ملے اور اس دعوئی پر ان کا مجموعۂ فتاوئی شاہد ہے۔ نیز اُن کی تصنیف "کفل الفقیہ الفاھم فی احکام قرطاس الدراھم" جو انہوں نے ۱۳۲۳ھ میں مکہ معظمہ میں لکھی تھی۔

مفتی محمد مکرم احمد

شاہی امام، مسجد فتح پوری، دہلی

آپ نے ملک کے نامور علما مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد دیوبندی وغیرہ کے سامنے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے۔ آپ علامہ بریلوی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ آپ میں وہ خوبیاں پائی جاتی تھیں کہ آپ کو "مجدد مائۃ الحاضرۃ" کہا جاتا۔ بے شک مولانا احمد رضا خان صاحب ایک جلیل القدر والمنزلۃ عالم باعمل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر وہ صفاتِ عالیہ ودیعت کی تھیں جن کی اس زمانہ میں ضرورت

تھی۔ عقل حیران و پریشان ہے کہ معاصرین علمائے دیوبند نے آپ کی شخصیت کو کس بے دردی، احسان فراموشی اور غیر عالمانہ انداز میں قعرِ گمنامی میں گرادیا۔ مَیں نے مولوی حسین احمد صاحب مدنی کی تصنیفات اور مکتوبات وغیرہ پڑھے ہیں لیکن زیرِ بحث کتاب (الشہاب ثاقب) میں آپ نے جس غیر عالمانہ انداز میں بحث فرمائی ہے وہ شایانِ شانِ عالم ہرگز نہیں۔" ۲۰

شاعرِ مشرق علامہ اقبال

۱۹۳۲ء میں علامہ اقبال ایک دعوت کے موقع پر پروفیسر سیّد سلیمان اشرف کے علی گڑھ گئے۔ اس موقع پر احمد رضا کا ذکر نکلا تو انہوں نے مولانا بریلوی کو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

"ہندوستان کے دورِ آخر میں اُن جیسا طباع اور ذہین فقیہہ پیدا نہیں ہوا...... مَیں نے اُن کے فتاوٰی کے مطالعہ سے یہ رائے قائم کی ہے۔" ۲۱

کالی داس گپتا رضا

"اسلامی دنیا میں اُن کے مقامِ بلند سے قطع نظر اُن کی شاعری بھی اس درجہ کی ہے کہ انیسویں صدی کے اساتذہ میں برابر کا مقام دیا جائے۔ ذرا غور و فکر کے بعد اُن کے اشعار ایک ایسے شاعر کا پیکر، دل و دماغ پر مسلّط کردیتے ہیں جو محض ایک سخن ور کی حیثیت سے بھی اگر میدان میں اُترتا تو کسی استادِ وقت سے پیچھے نہ رہتا۔ اُن کے کلام سے اُن کے کامل صاحبِ فن اور مسلم الثبوت شاعر ہونے میں شبہ نہیں۔" ۲۲

پاکستان

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی

"مَیں جناب رضا بریلوی کی دینی خدمات کا مداح اور معترف ہوں اور اُن کو اسلام کے مجاہدین و مبلغین کی صفِ اوّل میں شامل سمجھتا ہوں۔ عشقِ رسول کا جذبہ اُن کی نثر اور نظم میں ہر جگہ موجود ہے اور چونکہ اس کی بنیاد جذبے کی صداقت اور موضوع کی لطافت ہے اس لیے اس کا اثر آفرین ہونا قدرتی امر ہے۔" ۲۳

ڈاکٹر عبادت بریلوی

صدر شعبۂ اردو، پنجاب یونی ورسٹی، پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور

"مولانا احمد رضا خاں بہت بڑے عالمِ دین، مفکرِ اسلام اور عاشقِ رسول تھے۔ اُن کا نام

علماے اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ انہوں نے اپنی تصانیف سے علومِ اسلامی میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔'' ۲۴

ڈاکٹر پیر محمد حسن

شیخ الادب، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول پور

''اعلیٰ حضرت کا علم متحضر تھا۔ انہیں کتابیں ٹٹولنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ جس مسئلہ پر انہوں نے قلم اٹھایا ہے بے تکلف لکھتے گئے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مسائل کی کتابیں ان کے سامنے پڑی ہیں، اگر کہیں انہوں نے تلخ لب ولہجہ اختیار کیا ہے تو اس کی وجہ مخالفین کی شانِ رسالت میں گستاخی ہے۔'' ۲۵

پروفیسر امتیاز علی

وائس چانسلر، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور

''حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنے عہد کے جید عالم، مقبول نعت گو اور صدہا دینی وعلمی کتب ورسائل کے مصنف تھے۔ دینی علوم خصوصاً فقہ وحدیث پر موصوف کی نظر بڑی وسیع اور گہری تھی۔ فقہی مسائل میں ''فتاویٰ رضویہ'' اُن کا بہت اہم علمی کارنامہ ہے۔ جنگِ عظیم اوّل کے بعد ملکی سیاست کے ہنگامہ خیز دور میں ترکِ موالات اور تحریکِ ہجرت کے خلاف حضرت مولانا بریلوی کے فتوے نیز متحدہ قومیت کے بارے میں انتہائی بیانات ان کی سیاسی بصیرت کا ثبوت ہیں۔'' ۲۶

پروفیسر کرّار حسین

سابق وائس چانسلر، بلوچستان یونی ورسٹی

''میں اُن کی شخصیت سے اس وجہ سے متاثر ہوں کہ انہوں نے علم وعمل میں عشقِ رسول کو وہ مرکزی مقام دیا ہے، جس کے بغیر تمام دین جسدِ بے روح کی مانند ہے۔'' ۲۷

ڈاکٹر خواجہ معین الدین جمیل

فاضل استاذ، قائد اعظم یونی ورسٹی

''مولانا احمد رضا خان کی شخصیت سے بھلا کون واقف نہیں۔ انہوں نے اپنے دور میں اپنے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، وہ ہماری ملی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔'' ۲۸

ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان

سابق صدر شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی

"اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک عاشقِ رسول یعنی مولانا احمد رضا خان بریلوی (المتوفی ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کا ذکر کر دیا جائے، جن سے ہمارے ادبا نے ہمیشہ بے اعتنائی برتی ہے۔ حالانکہ یہ غالباً واحد عالمِ دین ہیں جنھوں نے نظم و نثر دونوں میں اردو کے بے شمار محاورات استعمال کیے ہیں اور اپنی علمیت سے اردو شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں۔" ۲۹

(مقالہ، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان، قلمی۔ ص ۹)

"اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں علیہ الرحمہ اپنے دور کے بے مثل علما میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کے فضل و کمال، ذہانت، طباعی و درّاکی کے سامنے بڑے بڑے علما و فضلا، یونی ورسٹیوں کے اساتذہ، محققین، مستشرقین نظروں میں نہیں جچتے...... وہ کون سا علم ہے جو انہیں نہیں آتا تھا اور کون سا فن ہے جس سے وہ واقف نہیں تھے۔ شعر و ادب میں اُن کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ اگر صرف محاورات، مصطلحات، ضرب الامثال اور بیان بدیع سے متعلق تمام الفاظ ان کی جملہ تصانیف سے یک جا کر لیے جائیں تو ایک ضخیم لغت تیار ہو سکتی ہے۔" ۳۰

پروفیسر ابرار حسین

علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

"میرا اپنا ذاتی خیال ہے کہ ریاضی کے میدان میں اعلیٰ حضرت کا مقام بہت بلند ہے۔"

(مکتوب بنام پروفیسر مسعود احمد، محررہ ۱۹ / اپریل ۱۹۸۰ء)

انگلستان

ڈاکٹر باربرا مٹکاف

کیلی فورنیا یونی ورسٹی

ڈاکٹر مٹکاف نے ۱۹۷۶ء میں "ہندستان میں مذہبی قیادت ۱۸۶۰ء تا ۱۹۰۰ء" کے عنوان سے انگریزی میں ایک کتاب لکھی۔ ڈاکٹر مٹکاف نے اس کتاب کے ایک باب میں احمد رضا کا ذکر کیا، جس میں وہ لکھتی ہیں:

"وہ خلوت کو پسند کیا کرتے تھے اور جب وہ باہر آتے تھے تو لوگ اُن کو ہاتھ لگانے کے

لیے لپکتے تھے، کوئی اُن کا ہاتھ چومتا تھا اور کوئی پیر...... احمد رضا نے ایک سرپرست کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کیا۔ اُن کا کردار اہلِ دیوبند کے کردار سے مختلف رہا۔ چونکہ علمائے دیوبند کے پاس انعام واکرام تقسیم کرنے کے ذرائع نہ تھے اور نہ اُن کی طبیعت کا میلان ہی اس طرف تھا۔ برخلاف ان کے احمد رضا عید پر اپنے طلبہ کو تحفے دیا کرتے تھے۔ نجی تقریب میں اُن کی دعوتیں کرتے ...... اُن کے اردگرد ہندوستان کے بہت سے طلبہ جمع تھے۔" ۳۱

پروفیسر غیاث الدین قریشی

نیو کاسل یونی ورسٹی، نیو کاسل

انگریزی ترجمہ: "شریعت اسلامیہ کے صرف حنفی کتب فکر کے مسائل میں انہوں نے جس ذہن رسا کا ثبوت دیا ہے اس سے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ اُن کو فضل وکمال کی بلند ترین مسند پر بٹھایا جائے۔ وہ جودتِ طبع اور وسعتِ علم کے مالک تھے۔ اُن کی نگاہ کی تیزی اور صفائی ایک عظیم ذہن کی خاص علامت ہے۔" ۳۲

پروفیسر جے۔ ایم۔ ایس بلیان

شعبۂ علوم اسلامیہ، لیڈن یونی ورسٹی، ہالینڈ

"احمد رضا خاں اپنے فتووں میں دلائل وشواہد پیش کرتے وقت جس وسعتِ مطالعہ کا اظہار فرماتے ہیں اس سے بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔"

(مکتوب مؤرخہ ۲۱ر نومبر ۱۹۸۶ء، محمد مسعود احمد)

"فقیہات پر احمد رضا خاں کی وسعتِ علم سے مَیں بہت ہی متاثر ہوا ہوں۔ بالعموم اُن کے خیالات بہت متوازن ہوتے ہیں اور ایک اجنبی قاری کے لیے معقول ہوتے ہیں۔"

(مکتوب مؤرخہ ۱۱ر جون ۱۹۸۷ء بنام محمد مسعود احمد)

مآخذ

۱۔ الاجازاۃ المتینہ ...... حامد رضا خاں ...... ص ۷

۲۔ الاجازاۃ المتینہ ...... حامد رضا خاں ...... ص ۱۳

۳۔ الفیوضات المکیہ ...... احمد رضا خاں ...... ص ۲۷

۴۔ حسام الحرمین ...... احمد رضا خاں ...... ص ۱۵۸

۵۔ حسام الحرمین ...... احمد رضا خاں ...... ص ۱۲۷۔۱۲۸

۶۔ حسام الحرمین...... احمد رضا خاں ...... ص ۱۷۶

۷۔ الفیوضات المکیہ ...... احمد رضا خاں ...... ص ۸۲

۸۔ حسام الحرمین...... احمد رضا خاں ...... ص ۲۱۸

۹۔ حسام الحرمین...... احمد رضا خاں ...... ص ۱۷۰

۱۰۔ الفیوضات المکیہ ...... احمد رضا خاں ...... ص ۹۲

۱۱۔ المیزان (بمبئی) امام احمد رضا نمبر ...... مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۴۳۵

۱۲۔ المیزان (بمبئی) امام احمد رضا نمبر ...... مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۴۵۵۔۴۵۶

۱۳۔ المیزان (بمبئی) امام احمد رضا نمبر ...... مارچ ۱۹۷۶ء، ص ۵۴۹

۱۴۔ امام احمد رضا اور عالمی جامعات ...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۴۸

۱۵۔ انوار رضا۔ امام احمد رضا نمبر...... ۱۹۷۷ء، ص ۳۹۳۔۳۹۴

۱۶۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت ...... ظفر الدین بہاری، ص ۱۰۱۲

۱۷۔ فاضلِ بریلوی علمائے حجاز کی نظر میں ...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۱۰۱۲

۱۸۔ حیاتِ اعلیٰ حضرت ...... ظفر الدین بہاری، ص ۱۰۱۲

۱۹۔ نزھۃ الخواطر، الجزء الثامن ...... عبدالحیٔ لکھنوی، ص ۴۱

۲۰۔ امام احمد رضا اور عالمی جامعات...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۴۴

۲۱۔ امام احمد رضا اور عالمی جامعات...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۸

۲۲۔ المیزان (بمبئی) امام احمد رضا نمبر ...... مارچ ۱۹۷۶ء، ص

۲۳۔ خیابانِ رضا...... محمد مرید احمد چشتی، ص ۳۷

۲۴۔ خیابانِ رضا...... محمد مرید احمد چشتی، ص ۴۴

۲۵۔ پیغاماتِ یومِ رضا...... محمد مقبول احمد، ص ۴۲

۲۶۔ خیابانِ رضا...... محمد مرید احمد چشتی، ص ۴۴

۲۷۔ امام احمد رضا اور عالمی جامعات ...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۳۲

۲۸۔ خیابانِ رضا...... محمد مرید احمد چشتی، ص ۱۱۵

۲۹۔ اخبار جنگ، کراچی ...... شمارہ ۱۲ر فروری ۱۹۷۷ء، ص ۱

۳۰۔ امام احمد رضا اور عالمی جامعات ...... پروفیسر محمد مسعود احمد، ص ۵۳

□□□□□□

رضا شناسی کا عمل: کچھ مثبت اور منفی پہلو

--- ڈاکٹر مفتی محمد امجد رضا امجد
القلم فاؤنڈیشن، پٹنہ

عظیم شخصیتیں ہر دور میں مظلوم رہی ہیں، شخصی عظمت اور علمی و ملی خدمات کے باوجود انہیں اپنے مخالفین ہی نہیں بلکہ ایسے نام نہاد موافقین کے ہاتھوں بھی مصلوب ہونا پڑا ہے جو حرصِ دنیا کے شکار ہیں۔ ایسا شاید اس لیے کہ حق کی راہیں دشوار گذار ہوتی ہی ہیں اور عشق کا راستہ پھولوں کی چھاؤں سے نہیں بلکہ کانٹوں کی باڑھ سے ہوکر گذرتا ہے۔ ؎ بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست

چودھویں صدی ہجری میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان نے جو علمی اور تجدیدی کارنامے انجام دیے اور قوم وملت کے لیے سیاسی، سماجی، علمی، ملی، مذہبی خدمات کو جس طرح تسلسل کے ساتھ تاحینِ حیات جاری رکھا وہ سبھوں پر عیاں ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کے مخالفین و ناقدین کل بھی اُن کی کردار کشی پر مصر تھے اور آج بھی اُن کی علمی شخصیت کو مجروح کرنے کے لیے پوری طرح کمر بستہ ہیں۔ کیا یہ وہی مظلومیت نہیں جو بھی عظیم مفکر، قاید، مصلح اور داعیِ حق کا کسی نہ کسی انداز سے مقدر بنتی رہی ہے۔ ؎ ایں نکتہ را شناسد آں دل کہ دردمند است

امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان کے مخالفین نے نصف صدی تک ملک و بیرون ملک ان کے خلاف محاذ آرائی کی، انہیں متشدد کہا، مکفر المسلمین کہا، بدعات کا موجد اور بریلویت کا بانی کہا، انگریزوں سے روابط کا فسانہ گڑھا۔۔۔ مگر تا کجے، خوشبوؤں پہ پہرا بٹھایا نہیں جاسکتا، ہوا پر بند قائم نہیں کی جاسکتی۔ اب رفتہ رفتہ مخالفین کی پھیلائی ہوئی افواہوں کے کہرے چھٹ رہے ہیں اور علمی دنیا اُن کی خدمات سے آشنا اور اُن کے علم سے فیض یاب ہورہی ہے۔ اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کل کی بہ نسبت آج علمی حلقوں میں امام احمد رضا کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہے۔ اور اُن کے اوپر لگائے گئے الزامات کی سطحیت و غیر معقولیت طشت از بام ہوگئی ہے۔ تاہم اگر مخالفین کے بالمقابل اپنی دفاعی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس تعلق سے ہماری کارکردگی ایک حد تک ناقص بھی ہے اور سُست بھی۔ ان میں ترتیب و انضباط نہیں۔ کام کرنے والے افراد کے پیش نظر کوئی جامع منصوبہ نہیں۔ طریقۂ کار میں معقولیت و مصلحت اندیشی کی جس حد تک ضرورت ہے اس کا پاس و احساس نہیں۔ جس کا نتیجہ ہے کہ پیہم محنتوں کے باوجود خاطر خواہ کامیابی نہیں مل پارہی ہے۔ اگر ہم رضویات کے فروغ و استحکام کے لیے واقعی مخلص ہیں تو ہمیں سنجیدگی سے اس موضوع پر غور وفکر کرنا ہوگا۔ اپنی کوتاہیوں کی گرفت کرنی ہوگی اور منصوبہ بند طریقے سے

اس مشن کو آگے بڑھانا ہوگا۔

شدت پسندی کا الزام اور اس کی حقیقت:

مخالفین نے امامِ اہلِ سُنّت پر شدّت پسندی کا الزام جس شدّت سے لگایا تھا علماے اہلِ سُنّت نے اُس کا شافی و وافی جواب دے کر مخالفین کو خاموش کر دیا اور امام رضا کی شخصیت ایک مخلص داعی اور دردمند مصلح کی حیثیت سے نکھر کر سامنے آ گئی۔ مگر جماعتی اعتبار سے یہ الزام ہم پر آج بھی عاید ہے اور ہم متشدّد جماعت کے نام سے آج بھی جانے جاتے ہیں۔ اس میں شاید مخالفین کی سازشوں کے ساتھ کچھ ہمارا بھی دخل ہے۔ معتقدات سے لے کر معمولات تک کے معاملہ میں ہماری جماعت کے غیر تربیت یافتہ بعض علما وہ کچھ کر جاتے ہیں جس کی اجازت نہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ کے قول وعمل سے ملتی ہے اور نہ وہ قرینِ مصلحت ہے۔ شاید اسی شدّت مزاجی کے سبب اُن خانقاہوں سے ہمارے روابط منقطع ہو گئے یا کمزور پڑ گئے جن سے کبھی اعلیٰ حضرت کا گہرا اور مستحکم رشتہ تھا۔ امام احمد رضا نے اپنے اخلاق و کردار اور اصولی طرزِ عمل سے خانقاہوں کو مربوط رکھا، ان سے نیاز مندانہ و محبّانہ تعلقات رکھے۔ اسی اتحادِ فکر اور اعتقادی مماثلت کے سبب اہلِ خانقاہ نے ردِّ عقایدِ باطلہ کے معاملہ میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ہم نوائی و پشت پناہی کی۔ تحریکِ ردِّ ندوہ کے معاملہ میں خانقاہِ معظم بہار شریف کے صاحبِ سجّادہ شاہ امین احمد فردوسی، خانقاہِ منعمیہ قمریہ پٹنہ کے شاہ عزیز الدین قمری، خانقاہِ مجیبیہ پھلواری شریف کے شاہ محی الدین مجیبی، خانقاہِ ابوالعلائیہ داناپور کے شاہ اکبر داناپوری وغیرہ نے جس طرح حصّہ لیا وہ بہار کی خانقاہی تحریک اور اعلیٰ حضرت سے ان کے فکری و اعتقادی اتحاد کی تاریخ کا زرّیں باب ہے۔ امام احمد رضا علیہ الرحمہ کا قصیدہ ''آمال الابرار'' اس کا زندہ ثبوت ہے جس میں ان سارے حضرات کا تذکرہ آپ نے محبت وعقیدت سے کیا ہے۔ یہ سارے مشائخ مدرسہ حنفیہ، پٹنہ اور ماہ نامہ تحفۂ حنفیہ، پٹنہ کے قلمی و مالی معاون رہے۔ جب کہ ان کا مقصد اور موضوع عقایدِ باطلہ کی تردید اور اصلاحِ فکر و اعتقاد تھا۔ آج کتنی خانقاہوں سے ہمارے تعلقات استوار ہیں؟ اور ہم نے کتنی خانقاہوں سے اعلیٰ حضرت کے تعلق کو باقی رکھا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ آج اس تعلق کے باقی نہیں رہنے میں ان کا عمل دخل بھی کچھ کم نہیں مگر ساتھ ہی کیا ایسا نہیں ہے کہ ہمارے یہاں بھی کسی نہ کسی طبقہ میں تھوڑی بہت شدّت مزاجی ہے؟ ہم مسلک کی ترویج اور امام احمد رضا کی پاکیزہ تعلیمات کو عام کرتے وقت تحریر و تقریر اور جلسہ و کانفرنس میں تشدّد اور تصلّب کے فرق کو پیشِ نظر رکھیں؟

جماعتی اعتبار سے ہم پر تشدّد کے الزام کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مخالفین نے دانش وروں کے حلقہ میں ہماری جماعت کا تعارف ''شدّت مزاجی'' کے ساتھ ساتھ جاہلوں کی جماعت کے نام سے کرایا اور اپنا تعارف عالم، فقیہ، مؤرخ، محدّث، محقق کی حیثیت سے۔ جس وقت ہم ان کے اسلام مخالف عقاید کے

خلاف تحریری اور تقریری تحریکیں چلا رہے تھے اُن کا ایک طبقہ، مختلف علمی، فنی اور تاریخی موضوعات پر کتابیں تالیف کررہا تھا۔ آج قرآن و حدیث، فقہ، تاریخ، سیَر، غزوات اور لغات وغیرہ پر جو کتابیں دانش ورو کے مطالعہ میں ہیں تقریباً سب اُن کی ہی لکھی ہوئی ہیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ انہوں نے اس حلقے میں اپنی علمی شناخت قائم کرلی ہے اور اب وہ ہمارے معتقدات و معمولات پر تحریر و تقریر کے ذریعہ ہم پہ حملے کررہے ہیں۔ اگر ہم اس کا جواب دیتے ہیں تو متشدد کہے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم نے زیادہ تر اختلافی موضوعات پر کتابیں لکھ کر بادی النظر میں اپنی یہی شناخت بنائی ہے۔ مخالفین اپنا تشدد اور اپنا ظلم اپنی علمی شہرت میں چھپا لیتے ہیں مگر ہم اپنا علمی معیار قائم نہیں کراپانے کے سبب بدنام ہوکر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اپنی جماعتی شناخت علمی انداز سے کرائیں۔ ہمارے یہاں نہ علم کی کمی ہے اور نہ علمی افراد کی۔ انفرادی اعتبار سے ہمارے علما کا علمی وقار بہت بلند ہے اگر یہ حضرات اس ضرورت کو محسوس کرلیں اور کچھ نہیں تو صرف اعلیٰ حضرت علیہ الرحمۃ والرضوان کی مختلف علوم و فنون پر مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتابوں کو ترجمہ، تلخیص، تسہیل اور حاشیہ کے ساتھ جدید انداز میں سامنے لے آئیں تو شخصی اور جماعتی دونوں اعتبار سے یہ ایک بڑا کارنامہ ہوگا اور ہمیں جماعتی سطح پر اپنی علمی شناخت بنانے میں بھرپور مدد ملے گی۔ مولانا ابوالحسن ندوی نے اعلیٰ حضرت کے بارے میں کہا تھا کہ "ایک شخص نے ہمیں ایک صدی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔" (بحوالہ: رفاقت، امام رضا نمبر۔ مولانا شمس الہدیٰ مصباحی، ص ۴۳) اس تاثر کو آفاقی بنانے کے لیے ضروری ہے امام رضا کی تصانیف کی طرف سنجیدگی سے توجہ دی جائے۔

رضویات کے ناشرین اور اُن کی ذمہ داریاں:

رضویاتی مشن پر کام کرنے والے اداروں میں مرکزی مجلسِ رضا لاہور، ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی، المجمع الاسلامی اعظم گڈھ، رضا فاؤنڈیشن لاہور، رضا اکیڈمی برطانیہ، رضا اکیڈمی ممبئی، برکاتِ رضا گجرات، امام احمد رضا اکیڈمی بریلی شریف سرفہرست ہیں، جو ایک خاص مقصد کے تحت مصروف عمل ہیں۔ یونہی رسائل میں جہانِ رضا لاہور، معارفِ رضا کراچی، افکارِ رضا ممبئی، یادگارِ رضا ممبئی، تجلیاتِ رضا بریلی اور اسلامک ٹائمز برطانیہ ہی وہ رسائل ہیں جن کا مشن فروغِ رضویات ہے۔ ان رسائل نے ترسیلِ حقائق اور تفہیمِ رضویات میں بلاشبہ ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ جن کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر کہاں کہاں رضویات کے موضوع پر کیا کام ہورہا ہے، کتنی پیش رفت ہوئی ہے، امام رضا کی کس کتاب کا ترجمہ ہوا، کس نے کیا، کتاب کب چھپی اور کتنی بار چھپی وغیرہ۔ ان اداروں نے اپنے قیام سے اب تک اپنے مقاصد کی تکمیل اور اہداف کے حصول کے لیے جتنی بھی کوششیں کی ہیں ان کے خوش گوار اثرات ہمیں دیکھنے، پڑھنے، سننے کو مل رہے ہیں۔ ماضی قریب میں ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی کا

جامعہ ازہر سے رابطہ، وہاں کے اساتذہ کو اعلیٰ حضرت سے متعارف کرانا۔ وہاں سے امام احمد رضا والعالم العربی، بساتین الغفران، صفوۃ المدیح، المنظومۃ السلامیہ فی مدح خیر البریہ اور یادگار مجلّہ الکتاب المتدکاری۔ مولانا امام احمد رضا خاں جیسی کتب اور مجلّہ کا مرتب ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے ادارے مخلصانہ جذبے کے ساتھ جدوجہد میں مصروف ہیں۔ ہاں تھوڑی بے ضابطگی ہے جس سے خرچ کے باوجود مطلوبہ مقاصد کے حصول میں تاخیر ہورہی ہے۔ اگر طریق کار میں تھوڑی تبدیلی کرلی جائے تو کم مدّتوں میں بڑے بڑے مقاصد حل ہوسکتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اردو کی بہ نسبت عربی زبان میں رضویات پر کام کرنے کی زیادہ ضرورت ہے کہ عرب ممالک ہی مخالفین کی قوتوں کا سرچشمہ ہیں۔ اگر وہاں کے علما و دانش ور حضرات تک ہماری کتابیں پہنچ گئیں تو خوش گوار انقلاب آنے میں دیر نہیں لگے گی۔

فروغ رضویات کے توجہ طلب اُمور:

امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان کی علمی، فنّی مذہبی اور سیاسی و سائنسی خدمات کو عام کرنے اور عالمی سطح پر اُن کی شخصیت کو تسلیم کروانے کے لیے منصوبہ بند کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے رضویات پر کام کرنے والے اداروں کا باہم مربوط رہنا، تقسیم کار کرلینا اور کام کی اہلیت رکھنے والے افراد سے باضابطہ کام لینا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً یہ کہ:

﴿۱﴾ ترجیحی بنیادوں پر امام احمد رضا کی عربی کتابوں اور ضروری کتابوں کے عربی تراجم، بالخصوص فتاویٰ رضویہ بڑے پیمانے پر شائع ہوں اور عرب ممالک میں پھیلائی جائیں۔

﴿۲﴾ عرب علما سے مراسم بڑھائے جائیں۔ ان کو نیک مقاصد کے تحت اپنے یہاں مدعو کیا جائے۔

﴿۳﴾ ترکی والے مکتبہ سے تعلق قائم کیا جائے۔ انہوں نے امام احمد رضا اور دیگر سُنّی علما کی کتابیں شائع کرکے پوری دنیا میں پھیلائی ہیں۔ انہیں امام احمد رضا کی کتابیں بغرضِ اشاعت دی جائیں تاکہ عربی کتابیں عرب ممالک میں آسانی سے عام ہوسکیں۔

﴿۴﴾ مرکز الثقافۃ کیرالا سے رابطہ استوار کرکے بالمعاہدہ کام کیا جائے۔ عرب ممالک میں ان کے ذریعہ بھی بڑا کام ہوسکتا ہے۔

﴿۵﴾ جامعہ ازہر مصر سے رابطہ اور مستحکم کیا جائے۔ وہاں ۱۲ ربیع الاوّل شریف کا پروگرام عالمی سطح پر اہتمام سے منعقد ہوتا ہے جس میں عالم اسلام کے علما مدعو ہوتے ہیں وہاں ہمارے یہاں سے وفد یا مندوبین کی شکل میں علما شرکت کریں۔ انہیں امام احمد رضا کی کتابیں دیں، ان سے تاثرات لیں، ان کو رابطے میں رکھیں، اپنے یہاں مدعو کریں۔ تاکہ رفتہ رفتہ وہ امام احمد رضا بریلوی کے علمی مقام سے متعارف ہوں۔

(باقی صفحہ 108 پر)

محدثِ اعظم ہند کچھوچھوی اور امام احمد رضا محدث بریلوی

از: غلام مصطفیٰ رضوی، (نوری مشن، مالیگاؤں)

محدث اعظم ہند ابوالمحامد سید محمد اشرفی جیلانی (ولادت: ۱۵؍ذی قعدہ ۱۳۱۱ھ/۱۸۹۴ء وصال ۱۶؍رجب المرجب ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱ء) محدث و مفسر، مفکرِ ملت اور خطیب بے نظیر تھے۔ آپ کی بصیرت اپنے زمانے سے آگے دیکھتی تھی۔ گفتگو سے ملت کا درد ٹپکتا۔ نباضِ قوم اور طبیب حاذق تھے۔ مجددِ اسلام اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی (ولادت: ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۶ء وصال: ۱۳۴۰ھ/۱۹۲۱ء) کے شاگردِ رشید اور خلیفۂ اجل تھے۔

سیاسی بصیرت: ہندوؤں سے اتحاد و وِداد کی تحریک نے اسلامیانِ ہند کو کافی کچھ نقصان پہنچایا تھا۔ اس سے جہاں مسلمانوں کے تشخص کا مسئلہ لاحق تھا وہیں ایمان و ایقان کی تباہی کا بھی خدشہ تھا۔ بہت سے اپنی ایمانی حمیت اور ملی غیرت گنوا بیٹھے تھے۔ اس کے سدّ باب میں امام احمد رضا نے بہت سے فتاویٰ تحریر فرمائے اور ایک تاریخی کتاب ''المحجة المؤتمنه فی آیة الممتحنه'' (۱۳۳۹ھ) لکھی جس کے ہمہ گیر اثرات ظاہر ہوئے۔ اس میں انگریزوں کے خلاف سرگرم سیاسی تحریک کی آڑ میں اسلام کے خلاف رچی جانے والی سازشوں کا پردہ چاک کیا۔ امام احمد رضا کی سیاسی بصیرت و تدبر سے محدث اعظم ہند نے وافر حصہ پایا تھا۔ آپ نے امام احمد رضا کی اصلاحی تحریک کے لیے سرگرم کردار ادا کیا اور مشرکین کی سیاسی چالوں سے ہندوستانی مسلمانوں کو باخبر کیا جس پر آپ کے خطبات وارشادات شاہدِ عدل ہیں۔

۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں اجمیر میں جو صدارتی خطبہ ارشاد فرمایا اس کا ایک گوشہ تحریر کیے دیتا ہوں جو محدث اعظم ہند کی سیاسی بصیرت کا غماز ہے:

''زمانہ میں روشنی کے نام پر الحاد کی تاریک آندھیاں چلیں۔ دین فروشوں نے دین کے نام کو پیٹ کا دھندا بنایا۔ کھلے بازار میں ملت فروشی کی جارہی ہے۔ ضمیر فروشی، قوم فروشی کا بلیک مارکیٹ قانون کی زد سے بھی آزاد ہے۔ نام دارالعلوم رکھا اور کام وِدّیا مندر کا کیا۔ نام پوچھو تو احرار بتائیں اور کام دیکھو تو غلاموں کی غلامی پر اِترائیں۔ یارسول اللہ سن کر گھبرائیں اور بندے ماترم کا ترانہ گائیں۔ نعرۂ تکبیر سے اُلجھیں اور اپنے باپو (گاندھی) کی جے منائیں۔ مسلمانوں سے بے زار اور مشرکوں کے علم بردار۔ اب تو جھنڈ کا رنگ ایسا چڑھا ہے کہ پہچاننا دشوار کہ مولوی جی ہیں یا مالوی جی ہیں۔ مگر اے خواجہ! تیری خواجگی کے قربان کہ تیرے مست تیرے ہی رہے۔ تیری تعلیم، تیرے پیغام سے ایک انچ نہ ہٹے۔ چودہ سو برس کی پرانی

لکیر کے فقیر بنے رہے۔ مشرک کے پاؤں پر توحید کو کھڑا نہیں کیا اور کسی قیمت پر اپنے دین کو نہیں بیچا۔"[۱]

امام احمد رضا سے تعلقات: محدث اعظم ہند نے ابتدائی تعلیم والد ماجد سے لی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (م ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء)، مفتی لطف اللہ علی گڑھی (م ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء)، مولانا شاہ عبدالمقتدر بدایونی (م ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) سے تحصیلِ علم فرمایا۔ علمِ حدیث میں مولانا وصی احمد محدّث سورتی (م ۱۳۳۴ھ/ ۱۹۱۶ء) سے استفادہ فرمایا۔ امام احمد رضا سے فقہ و افتا کی تعلیم لی۔ اور خلافت سے بھی نوازے گئے۔ امام احمد رضا کے تذکرے آپ نے مولانا وصی احمد محدث سورتی کی زبانی سن رکھے تھے اور یہ تذکرے آپ کے دل میں گھر کر گئے۔ محدث اعظم ہند فرماتے ہیں۔

"میرے استادِ فنِ حدیث کے امام کو بیعت حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب گنج مراد آبادی سے تھی۔ مگر حضرت کی زبان پر پیر و مرشد کا ذکر میرے سامنے کبھی نہ آیا۔ اور اعلیٰ حضرت کے بکثرت تذکرے محویت کے ساتھ فرماتے رہتے ہیں۔ اس وقت تک بریلی حاضر نہ ہوا تھا۔ اس انداز کو دیکھ کر میں نے ایک دن عرض کیا کہ آپ سے آپ کے پیر و مرشد کا تذکرہ نہیں سُنتا اور اعلیٰ حضرت کا آپ خطبہ پڑھتے رہتے ہیں۔ فرمایا کہ جب مَیں نے پیر و مرشد سے بیعت کی تھی بایں معنیٰ مسلمان تھا کہ میرا سارا خاندان مسلمان کا خاندان سمجھا جاتا تھا۔ مگر جب میں اعلیٰ حضرت سے ملنے لگا تو مجھ کو ایمان کی حلاوت مل گئی۔ اب میرا ایمان رسمی نہیں بلکہ بعونہٖ تعالیٰ حقیقی ہے۔ جس نے حقیقی ایمان بخشا اس کی یاد سے اپنے دل کو تسکین دیتا رہتا ہوں۔"[۲]

حضرت محدّث سورتی قدس سرہ، امام احمد رضا کے ہم عصر اور محبّ تھے۔ نیز گہرے روابط و مراسم تھے۔ محدّث سورتی حافظِ بخاری تھے۔ علمِ حدیث میں آپ بڑی گہری نگاہ اور دسترس رکھتے تھے۔ محدّث اعظم ہند نے آپ سے امام احمد رضا کے محدّثانہ مقام کی بابت دریافت کیا اور جو جواب آپ نے ارشاد فرمایا اس سے محدّث اعظم کے ذوق کو مہمیز ملی اور بریلی سے رغبت بڑھ گئی۔ اس کا حال محدّث اعظم کی زبانی سنیے:

"مَیں نے عرض کیا کہ علم الحدیث میں کیا وہ (اعلیٰ حضرت) آپ کے برابر ہیں؟ فرمایا کہ ہرگز نہیں۔ پھر فرمایا کہ شہزادہ صاحب! آپ کچھ سمجھے کہ ہرگز نہیں کا کیا مطلب ہے۔ سُنیے کہ اعلیٰ حضرت اس فن میں "امیر المومنین فی الحدیث" ہیں کہ میں سالہا سال صرف اس فن میں تلمذ کروں تو بھی اُن کا پاسنگ نہ ٹھہروں۔ حضرت محدّث صاحب قبلہ کے اسی قسم کے ارشادات نے میرے دل کو بریلی کی طرف کھینچا اور بالآخر آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اعلیٰ حضرت کیا ہیں۔"[۳]

امام احمد رضا کے تدریسی احوال اور طرزِ تربیت کو محدّث اعظم سرمایۂ افتخار قرار دیتے اور اُن لمحات کو

متاعِ حیات گردانتے ہیں۔ محدّث اعظم ہند کے محسوس کلمات ملاحظہ فرمائیں اور امام احمد رضا سے آپ کے اٹوٹ تعلق کا اندازہ لگائیں:

''جب تکمیل درسِ نظامی و تکمیل درس حدیث کے بعد میرے مربّیوں نے کارِ افتا کے لیے اعلیٰ حضرت کے حوالہ کیا۔ زندگی کی یہی گھڑیاں میرے لیے سرمایۂ حیات ہوگئیں اور مَیں محسوس کرنے لگا کہ آج تک جو کچھ پڑھا تھا وہ کچھ نہ تھا اور اب ایک دریاے علم کے ساحل کو پالیا ہے۔ علم کو راسخ فرمانا اور ایمان کو رگ وپے میں اتار دینا اور صحیح علم دے کر نفس کا تزکیہ فرمادینا، یہ وہ کرامت تھی جو ہر منٹ پر صادر ہوتی رہتی تھی۔'' ۴

امام احمد رضا کے وصال کے بعد آپ ہر سال پابندی سے عرسِ رضوی میں شرکت فرماتے۔

مجددانہ شان اور فہم و فراست: اکثر خطبات میں آپ امام احمد رضا قدس سرہ کا تذکرہ بڑے دل پذیر انداز میں فرماتے۔ آپ کے دستیاب خطبات سے ایسے تذکرے یک جا کیے جائیں تو ایک دفتر تیار ہو جائے گا۔ اس سمت توجہ کی ضرورت ہے۔ امام احمد رضا کی مجددانہ شان، فرق ہاے باطلہ کی تردید میں سعی و کاوش، احقاقِ حق میں نمایاں کردار، مومنانہ شان اور وسیع فہم و فراست پر محدّث اعظم ہند اپنے ایک خطبۂ صدارت میں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

''یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ نے ایک ایسی بلند ترین شخصیت سے اُمّت اسلامیہ کو نوازا جس کو عرب و عجم نے اپنا امام مانا۔ جن کو اربابِ بصیرت نے مجدد مأتہ حاضرہ کہا اور جن کی نگاہ فراست نے ایک ایک عیار و غدار کو پہچان لیا، فریب کے لبادوں کو اُتار کر عیاری کو برہنہ کردیا۔ اُن کی فقاہت، اُن کی درایت، اُن کے مطالعہ کی کثرت، اُن کا رسولِ پاک ﷺ سے والہانہ عشق و محبت، دشمنوں پر ان کے نیزوں کی مار، باطل کی گردن پر ان کی باطل شکن تلوار یہ ہیں وہ چیزیں جن کی اسلامی دنیا میں دھوم مچ گئی۔'' ۵

فرق ہاے باطلہ ناکام و نامراد ہوئے۔ بارگاہ خدا اور سول جل وعلا و ﷺ میں اُن کی گستاخیوں کے تار و پود بکھر کر رہ گئے۔ امام احمد رضا کی قلمی خدمات کے نتیجے میں باطل فرقوں کو جو درگت بنی اسے محدّث اعظم ہند ''سُنیوں کے منھ کو اُجالا'' کردینے سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں:

''یہ ہے اعلیٰ حضرت عظیم البرکۃ امام اہل سُنّت و جماعت مجدّد مأتہ حاضرہ موید ملت طاہرہ مولانا الشاہ احمد رضا خان قادری قدس سرہ العزیز و رحمۃ اللہ علیہ و رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی برگزیدہ ہستی کہ سُنّیوں کے منھ کو اُجالا کردیا اور دشمنوں کے منھ کو کالا کردیا۔'' ۶

وہابیت کی بیخ کنی: ہندستان میں مسلمانوں میں افتراق و انتشار کو پروان چڑھانے میں مولوی اسماعیل دہلوی کا نمایاں کردار رہا ہے۔ اس نے اپنی کتاب ''تقویۃ الایمان'' میں مسلّمہ عقاید و معمولات سے انحراف

کیا اور توحید کی آڑ میں اُمت مسلمہ پر شرک کا مہیب الزام عاید کیا۔ اسے انگریزوں کی مکمل حمایت حاصل تھی شاید اسی لیے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں متحرک کردار ادا کرنے والے علما انگریزوں کے مدمقابل تھے اور عقاید میں مولوی اسماعیل دہلوی کے خلاف تھے۔ بہر کیف علمائے حق نے اس کی وہابی تحریک کا شدید ردّ کیا اور علمی و تحقیقی کتابیں مرتب فرمائیں۔ وہابیت کے سدباب میں علمائے اہل سُنّت بشمول امام احمد رضا محدث بریلوی کے نمایاں کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے محدث اعظم ہند تحریر فرماتے ہیں۔

''اس نے (مولوی اسماعیل دہلوی نے) بددینی و بدمذہبی یعنی توہب کی اشاعت شروع کی۔ ابن عبدالوہاب کے عقاید کے علاوہ اس نے اور بھی خباثتیں ایجاد کیں۔ قدم قدم پر شرک و بدعت کا ڈھیر لگادیا۔ اس کو اپنی شقاوت کے اعلان میں (انگریز) حکومت وسیف کی بے خوفی نے بڑی مدددی لیکن علمائے عصر وفضلائے دہر نے عمدہ طریقے سے بذریعہ سیفِ قلم اس کے مضامین کی گردن زدنی فرمائی۔ علمائے اہل سُنّت میں حضرت مولانا سیف اللہ المسلول مولوی فضل رسول صاحب بدایونی، حضرت ارسطوے زماں افلاطونِ دوراں فاضل بین الباطل والحق مولانا فضلِ حق صاحب خیرآبادی اور حضرت عظیم البرکت مجدد مائۃ حاضرہ موید ملت طاہرہ حامی سُنّت ماحی بدعت علامۂ دوراں فاضل زماں جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب خصوصیت رکھتے ہیں۔'' ہے

کلام رضاؔ کی تضمین: محدّث اعظم ہند ایک ادیب وخطیب اور مصنف و مدیر ہی نہیں بلکہ نعت گوشاعر بھی تھے۔ آپ کا دیوان ''فرش پر عرش'' کے نام سے رضوی کتاب گھر دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں ایک کلام امام احمد رضا کے مشہور کلام ؎

کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمھاری واہ واہ — قرض لیتی ہے گنہ پر ہیز گاری واہ واہ

کی تضمین میں تحریر فرمایا ہے بشکل مخمس۔ ملاحظہ فرمائیں:

پرشش اعمال میں وہ مہمان داری واہ واہ — باریابی اپنی پھر دیدار باری واہ واہ
بھر گئی جنت گنہگاروں سے سارہ واہ واہ — ''کیا ہی ذوق افزا شفاعت ہے تمہاری واہ واہ
قرض لیتی ہے گنہ پر ہیزگاری واہ واہ''

پنجۂ قدرت ہے پر انگشت بہر بحروبر — جب پھریں سورج پھرا اُٹھیں تو دوٹکڑے قمر
جھک رہا ان کے آگے ابرِ نیساں کا بھی سر — ''انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر
ندیاں پنجابِ رحمت کی ہیں جاری واہ واہ''

اک شب معراج کیا ہر روز و شب خود ہے گواہ — تک رہے ہیں رات دن ارض وسما ان کی ہی راہ
روزِ اوّل سے طریقہ ہے یہی شام و پگاہ — نور کی خیرات لینے دوڑتے ہیں مہر و ماہ

اٹھتی ہے کس شان سے گردِ سواری واہ واہ"

غنچۂ دل کیوں کھلا کیوں روبصحت ہے مزاج ۔۔۔ داغ سب گل بن کے کیوں مہکے گیا کیوں اختلاج

کس کے کوچے کی ہوانے کردیا میرا علاج ۔۔۔ کیا مدینہ سے صبا آئی کہ پھولوں میں ہے آج

کچھ نئی بو بھینی بھینی پیاری پیاری واہ واہ"

ایسے کوچے میں جہاں کی موت ہے رشکِ بقا ۔۔۔ جس کے کتوں پر کریں عشاق جان و دل فدا

تجھ سے اے سید یہ فرماتے ہیں مولانا رضا ۔۔۔ پارۂ دل بھی نہ نکلا دل سے تحفے میں ترا

اُن سگانِ کو سے اتنی جان پیاری واہ واہ"[8]

امام احمد رضا نے مقطع میں فرمایا "پارۂ دل بھی نہ نکلا دل سے تحفے میں رضا" محدث اعظم ہند نے تضمین میں امام احمد رضا کے مقطع کا مخاطب خود کو بنایا لہٰذا "رضا" کی جگہ "میرا" کردیا۔ اس سے آپ کی محبت و الفت اور عشقِ رسول ﷺ میں وارفتگی و فریفتگی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

غالباً یہ تضمین آپ نے دین و سنیت کی اشاعت کے سلسلے میں دورانِ سفر ٹرین میں قلم بند فرمائی جیسا کہ علامہ مشتاق احمد نظامی تحریری فرماتے ہیں:

"جس وقت در بھنگہ (بہار) اسٹیشن پہنچے تو حافظ خلیل مرحوم کار لے کر موجود تھے۔ جب کار چلی تو حضرت نے خلافِ معمول پان دیتے ہوئے ارشاد فرمایا: آج رات کی کمائی سنو، جیب سے ایک کاغذ کا ٹکڑا نکالا اور سیدنا امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ عنہ کی نعت پاک پر جو تضمین فرمائی اس کو سنایا۔"[9]

خطبۂ صدارت جشنِ یوم رضا ناگپور: جماعت اہل سنت ناگپور مہاراشٹر کے زیر اہتمام ماہِ شوال المکرم ۱۳۷۹ھ میں عظیم الشان جشنِ ولادت امام احمد رضا کا انعقاد ہوا جس میں خطبۂ صدارت محدّث اعظم ہند نے ارشاد فرمایا۔ آپ کا یہ خطاب بڑا مقبول ہوا اور کتابی شکل میں حیاتِ محدّث اعظم ہند ہی میں شائع ہوا۔ جماعتِ اہل سنت ناگپور نے ناظم پریس رام پور یوپی سے چھپوا کر شائع کیا۔ اسے محدّث اعظم ہند نے اپنے دستِ مبارک سے تقسیم بھی فرمایا۔ بعد کو پاکستان سے بھی اشاعت عمل میں آئی۔

فنِ خطابت میں آپ کو ملکہ حاصل تھا۔ محض خوب صورت الفاظ نہیں فرماتے بلکہ آپ کی خطابت سے ملّت کا درد و سوز بولتا۔ اور تڑپ و کسک چھلک جاتی۔ کیفیت کا حال محمد دین کلیم (مؤرخ لاہور) سے سُنیے! "راقم الحروف کئی دفعہ مسجد وزیر خان میں آپ کے مواعظِ حسنہ سے مستفید ہوا۔ آپ فنِ خطابت کے بادشاہ تھے۔ جب تقریر فرماتے تو فصاحت و بلاغت آپ کے ہم رکاب ہوتی۔ مجمع پر سکوت طاری ہوجاتا قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تو دل دہل جاتے۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتے تو حاضرین بے تاب و بے قرار ہوجاتے۔"[10]

ناگپور کے خطبے میں آپ نے حیاتِ رضا کے کئی ایک گوشے وا کیے ہیں۔ اندازِ بیان دل کش و دل پذیر ہے۔ اس میں امام احمد رضا کے علوم و فنون، تفسیر و حدیث میں مہارت، مجددانہ شانِ فقاہت اور استحضار علمی، علوم جدیدہ و قدیمہ میں دسترس اور فرق ہائے باطلہ کی تردید میں عدیم النظیر کردار پر شرح و بسط سے روشنی ڈالی ہے۔ چند جھلکیاں پیش کردی جاتی ہیں۔ واضح رہے کہ عنوانات راقم نے قائم کیے ہیں:

اہل سُنّت کا مہینہ: ۱۰ رشوال المکرم ۱۲۷۲ھ کو امام احمد رضا کی ولادت ہوئی۔ اس مناسبت سے شوال المکرم کو محدث اعظم ہند اہل سُنّت کا مہینہ قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"یہ شوال کا مہینہ ہے اور یہ اپنی ایک عظیم خصوصیت کی وجہ سے مستحق ہے کہ ہم اس ماہ کا نام "اہل سُنّت و جماعت ہند کا مہینہ" رکھیں۔ کیونکہ اس مہینہ میں ہندوستان میں اس قدم کا ظہور ہوا جس کی بلندی کو نہ صرف ہند بلکہ عرب و عجم کے تمام دینی و روحانی اراکینِ دین متین و اساطینِ مبین کے جھکے ہوئے سروں نے قبول کرلیا اور اس قدم کے نشان کو بھی معظم و مکرم رکھا۔" [۱۱]

القاب و آداب: امام احمد رضا کو عرب و عجم میں قسم قسم کے عمدہ سے عمدہ القاب و آداب سے یاد کیا گیا۔ ذرا محدث اعظم ہند کے انداز کو دیکھیں اور آپ کی محبت و والہانہ عقیدت کی داد دیں۔ کیسے کیسے خوب صورت اور پیارے پیارے القاب سے یاد کرتے ہیں:

"رسولِ پاک کا سچا نائب، علم کا جبلِ شامخ اور عملِ صالح کا اسوۂ حسنہ، معقولات میں بحرِ ذخار، منقولات میں دریائے ناپیدا کنار، اہلِ سُنّت کا امام، واجب الاحترام اور اس صدی کا باجماع عرب و عجم مجدد، تصدیقِ حق میں صدیقِ اکبر کا پرتو، باطل کو چھانٹنے میں فاروقِ اعظم کا مظہر، رحم و کرم میں ذوالنورین کی تصویر، باطل شکنی میں حیدری شمشیر، دولتِ فقہ و درایت میں امیر المؤمنین اور سلطنت قرآن و حدیث کا مسلم الثبوت وزیر المجتہدین، اعلیٰ حضرت علی الاطلاق، امامِ اہل سُنّت فی الآفاق، مجدد مأتہ حاضرہ، موید ملت طاہرہ، اعلم العلما عند العلما وقطب الارشاد علی لسان الاولیا، مولانا و فی جمیع الکمالات اولینا، فانی فی اللہ والباقی باللہ، عاشقِ کامل مولانا شاہ احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ ورضی اللہ تعالیٰ عنہ وارضاہ۔" [۱۲]

علم و فضل کا آفتاب: آج نرے تخصص (Specialization) کا دور ہے۔ ایک فن کا ماہر کسی دوسرے فن میں درک نہیں رکھتا۔ لیکن جب ہم امام احمد رضا کی شخصیت کو دیکھتے ہیں تو آپ تنہا ۵۰ سے زیادہ علوم و فنون کے ماہر نظر آتے ہیں اور ان میں آپ کی مستقل تصانیف بھی ملتی ہیں۔ ابوالمساکین مولانا محمد ضیاء الدین پیلی بھیتی (م ۱۳۶۴ھ) نے بڑا خوب صورت شعر کہا:

مرحبا صد آفرین اے بحرِ زخارِ علوم
چشمۂ رشد و ہدایت نورِ چشمِ کاملاں

محدّث اعظم ہند اچھوتے انداز میں امام احمد رضا کے علم وفضل کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تیرھویں صدی کی یہ واحد شخصیت تھی جو ختم صدی سے پہلے علم وفضل وکمال ہوکر اسلامیت کی تبلیغ میں عرب وعجم پر چھاگئی اور چودھویں صدی کے شروع ہی میں پورے عالمِ اسلام میں اس کو حق وصداقت کا منارۂ نور سمجھا جانے لگا۔ میری طرح سے سارے حل وحرم کو اس کا اعتراف ہے کہ اس فضل وکمال کی گہرائی اور اس علم راسخ کے کوہ بلند کو آج تک کوئی نہ پاسکا۔" [۱۳]

ایک اور مقام پر امام احمد رضا کے علوم وفنون کا تذکرہ نظریاتی اصلاح کے ضمن میں فرماتے ہیں:

"اعلیٰ حضرت نے کسی ایسے نظریے کو بھی صحیح سلامت نہ رہنے دیا جو اسلامی تعلیمات سے متصادم رہ سکے۔ اگر آپ وجودِ فلک کو جاننا چاہتے ہوں اور زمین وآسمان دونوں کا سکون سمجھنا چاہتے ہوں اور سیاروں کے بارے میں کل فی فلک یسبحون کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہوں تو ان رسائل کا مطالعہ کریں جو اعلیٰ حضرت کے رشحاتِ قلم ہیں اور یہ راز آپ پر ہر جگہ کھلتا جائے گا کہ منطق وفلسفہ وریاضی والے اپنی راہ کے کس موڑ پر کج رفتار ہوجاتے ہیں۔ یہ تو علوم وفنون کا حال تھا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ آج کی علمی دنیا پچاس علوم وفنون کے نام سے بے خبر ہے اور اعلیٰ حضرت کے قلم مبارک سے پچاس علوم وفنون کے مبسوط رسائل تیار ہیں۔" [۱۴]

استحضار علمی: محدّث اعظم ہند فرماتے ہیں:

"یہ چیز روز پیش آتی تھی کہ تکمیلِ جواب کے لیے جزئیاتِ فقہ کی تلاش میں جو لوگ تھک جاتے تو عرض کرتے۔ اسی وقت فرمادیتے کہ ردالمحتار جلد فلاں کے صفحہ فلاں کی سطر فلاں میں ان لفظوں کے ساتھ جزئیہ موجود ہے۔ درمختار کے فلاں صفحہ فلاں سطر میں یہ عبارت ہے۔ عالم گیری میں بقید جلد وصفحہ وسطر یہ الفاظ موجود ہیں۔ ہندیہ میں، خیریہ میں، مبسوط میں ایک ایک کتابِ فقہ کی اصل عبارت بقیدِ صفحہ وسطر ارشاد فرمادیتے۔ اب جو کتابوں میں جاکر دیکھتے تو صفحہ وسطر وعبارت وہی پاتے جو زبانی اعلیٰ حضرت فرمایا تھا۔ اس کو آپ زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خداداد قوتِ حافظہ سے ساری چودہ سو برس کی کتابیں حفظ تھیں۔" [۱۵]

امیر المؤمنین فی الحدیث: امام احمد رضا سے تعلقات کے زیرِ عنوان محدّث اعظم ہند کے استاذ مولانا وصی احمد محدّث سورتی جیسے یکتائے روزگار کا قول گزرا کہ امام احمد رضا "امیر المؤمنین فی الحدیث ہیں"۔ اب ذرا محدّث اعظم ہند کا تبصرہ ملاحظہ فرمائیں جس میں فنِ حدیث میں امام احمد رضا کے تعمق ودقت نظر پر روشنی پڑتی ہے۔

"علم الحدیث کا اندازہ اس سے کیجیے کہ جتنی حدیثیں فقہ حنفی کی ماخذ ہیں ہر وقت پیش نظر اور جن

احادیث سے فقہ حنفی پر بظاہر زد پڑتی ہے اس کی روایت و درایت کی خامیاں ہر وقت از بر۔ علم الحدیث میں سب سے نازک شعبہ علم اسماء الرجال کا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے سامنے کوئی سند پڑھی جاتی اور راویوں کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو ہر راوی کی جرح و تعدیل کے جو الفاظ فرمادیتے تھے اٹھا کر دیکھا جاتا تو تقریب وتہذیب و تذہیب میں وہی لفظ مل جاتا تھا۔ یحیٰ نام کے سیکڑوں راویانِ حدیث ہیں لیکن جس یحیٰ کے طبقہ اور اسناد اور شاگرد کا نام بتادیا جاتا تو اس فن کے اعلیٰ حضرت خود موجد تھے کہ طبقہ و اسماء سے بتادیتے کہ راوی ثقہ ہے مجروح۔ اس کو کہتے ہیں علم راسخ اور علم سے شغف کامل اور علمی مطالعہ کی وسعت اور خدا داد علمی کرامت فسبحان الذی فضل عبده علی جمیع اهل زمانه وله الحمد احمد رضائه۔" ١٦

رضا کے نیزے کی مار: کلکِ رضا جو باطل فرقوں کی لیے خوں خوار اور برق بار خنجر ہے۔ اس کی آب و تاب اور جولانی کا یہ عالم کہ ہر گستاخِ خدا و رسول جل وعلاو ﷺ بے نقاب ہوگیا۔ ان کا دامِ فریب ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ امام احمد رضا کی مجددانہ شان اور قلمی آن بان کو محدث اعظم ہند الفاظ میں تحسین کے کلمات پیش کرتے ہیں:

"دنیا کو اس حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ اعلیٰ حضرت جن کے قلم کے نیزے کی مار نے کسی کی آنکھیں پھوڑ دیں، کسی کو نمرود والی سزادی، کسی کو مبہوت کر کے رکھ دیا، یہاں تک کہ وہ مر کر مٹی میں مل گئے۔ یہاں پر بھی کراہتے رہے اور وہاں بھی چیختے ہیں مگر اتنی جرأت آج تک کوئی نہ کرسکا کہ اعلیٰ حضرت کی کسی تصنیف کا برائے نام ہی سہی رد لکھ کر چھاپ دے۔ میدانِ رزم اس مرد میدان کی خدا داد ہیبت و جلالت کا یہ عالم ظاہر کرتا ہے کہ اعلیٰ حضرت کا یہ ارشاد ایک طرح سے اظہار حقیقت ہے: وہ رضا کے نیزے کی مار ہے۔" ١٧

ملک سخن کے شاہ کی محتاط زبان وقلم: محدث اعظم ہند محتاط زبان قلم کا حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اعلیٰ حضرت کی زبان وقلم کا یہ حال دیکھا کہ مولیٰ تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں لے لیا ہے اور زبان وقلم نقطہ برابر خطا کرے اس کو ناممکن فرمادیا ہے۔ ذلك فضل الله يوتيه من يشاء۔" ١٨

عدیم الفرصتی کے باوصف سخن آرائی میں فضل و کمال اور شعر گوئی میں مہارت کو کلمات تبریک پیش کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ نیز اس میں قصیدۂ معراجیہ جو ایک ادبی شاہ کار ہے، سے متعلق ایک مشاہدہ بھی بیان فرمایا ہے:

"جس کے ایوانِ علم میں اپنے ساتھ قلم دوات اور دینی کتابوں کے سوا کچھ نہ ہو، جو عرب و عجم کا رہنما، اس کو شعر کہنے کو کیا کہا جائے۔ کسی سے شعر سننے کی فرصت کہاں سے ملتی ہے مگر شانِ جامعیت میں کمی کیسے ہو اور مملکت شاعری میں برکت کہاں سے آئے۔ اگر اعلیٰ حضرت کے قدم اس کو نہ نوازیں۔ حضرت

حسان رضی اللہ عنہ جس رشکِ جناں سے سرفراز تھے اس کی طلب تو ہر عاشق کے لیے سرمایۂ حیات ہے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت کے حمد و نعت کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے جس کا ایک ایک لفظ خود مست ہے اور سننے والوں کو مستی عطا کرتا رہتا ہے۔

ایک مرتبہ لکھنؤ کے ادیبوں کی شان دار محفل میں اعلیٰ حضرت کا قصیدۂ معراجیہ میں نے اپنے انداز میں پڑھا تو سب جھومنے لگے۔ میں نے اعلان کیا کہ اردو ادب کے نقطۂ نظر سے میں ادیبوں کا فیصلہ اس قصیدہ کی زبان کے متعلق چاہتا ہوں تو سب نے کہا کہ اس کی زبان تو کوثر کی دُھلی ہوئی زبان ہے۔" ۱۹

یہ تاریخی خطبہ ضرور اس لائق ہے کہ اس کے ہر ہر گوشے پر تبصرہ کیا جائے۔ علمی تجزیہ کیا جائے۔ اسلوب خطابت کے اصولوں سے جائزہ لیا جائے، اس کی ادبی ولسانی خوبیوں کو واضح کیا جائے۔ یوں ہی محدّث اعظم ہند کے اس خطبے کو جدید انداز میں شائع کر کے عام کیا جائے اور حواشی کا اہتمام بھی ہو۔ راقم نے صرف بعض گوشے پیش کیے ہیں۔

ابنانِ رضا کے تذکرے: امام احمد رضا قدس سرہ کے صاحب زادگان حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا خاں بریلوی (م ۱۳۶۲/۱۹۴۳ء) اور حضور مفتی اعظم علامہ شاہ محمد مصطفیٰ رضا نوری بریلوی (م ۱۴۰۲/۱۹۸۱ء) سے محدث اعظم ہند کے گہرے مراسم و تعلقات تھے۔ ان اکابر میں بڑی محبت و الفت تھی۔ دین وسُنّیت کے فروغ کے لیے مشترکہ جدوجہد فرماتے۔ باطل فرقوں کی سرکوبی میں ساتھ ساتھ ہوتے۔ اہل سُنّت میں اتحاد واتفاق کی فضا بنائے رکھتے۔

راقم نے محدث اعظم ہند کے نصف درجن خطبات کے مطالعہ کا شرف حاصل کیا۔ متعدد میں ابنانِ رضا کا تذکرہ پایا۔ انداز ایسا کہ الفت بھرا، اچھوتا اور نرالا، دل پذیر و دل نشیں۔

بنارس میں منعقدہ آل انڈیا سُنّی کانفرنس (بتاریخ ۲۶ تا ۳۰ راپریل ۱۹۴۶ء) میں خطبۂ صدارت آپ ہی نے ارشاد فرمایا۔ اس خطبے کے آغاز میں ماضی کے دریچے کو وا کیا ہے۔ آل انڈیا سُنّی کانفرنس کے تاسیسی اجلاس منعقدہ مراد آباد کا ذکر کرتے ہوئے حجۃ الاسلام علامہ حامد رضا خاں بریلوی کی فراست و بصیرت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

"مجھے یاد ہے کہ ۲۰، ۲۱، ۲۲، ۲۳، شعبان ۱۳۴۳ھ مطابق ۱۶، ۱۷، ۱۸، ۱۹، مارچ ۱۹۲۵ء کی تاریخیں تھیں۔ مراد آباد میں جامعہ نعیمیہ کا عظیم الشان میدان تھا اور ملک وملت کے حقیقی رہنماؤں کا جھمگٹا تھا اور بحیثیت صدر مجلس استقبالی حضرت بابرکت شیخ الانام حجۃ الاسلام مولانا شاہ حامد رضا خاں صاحب قبلہ قدس سرہ کا تاریخی خطبۂ استقبالیہ پڑھا جارہا تھا۔ جس کا لفظ لفظ آج بھی وہی معنویت اور نور ہدایت رکھتا ہے۔ جو اس وقت اس میں تھا اور جس کی کھلی کھلی پیشن گوئیوں کو ہماری بدقسمت آنکھوں نے دیکھا اور عالم ربانی و

عارف باللہ کے نور فراست کو آخر دنیا کو مان لینا پڑا جس کو یاد کر کے ہمارے دل کی گہرائیوں سے بے ساختہ آہ نکلتی ہے کہ کاش ہم درمیانی مدت کو ضائع نہ کرتے اور کاش دشمنان نظام اسلام کو ہم اسی دن پہچان گئے ہوتے تو آج ہم کتنے بلند مقام پر ہوتے اور درندگانِ زمانہ نے اسلام کی بھولی بھالی بھیڑوں کو جو شکار کرلیا ہے، ہم اس عظیم مصیبت سے محفوظ رہتے۔ آیئے ہم اور آپ سورۂ فاتحہ و اخلاص کا تحفہ روحِ حجۃ الاسلام کو ہدیہ کریں اور ان تمام اعیانِ اسلام کو ہدیہ کریں جن کو ہم اس عرصہ میں گم کر چکے ہیں۔'' ۲۰

حضور مفتی اعظم ہند کا محبت بھرا تذکرہ ملاحظہ ہو، جو دعائیہ کلمات پر مشتمل ہے:

''رب کریم ان کے (اعلیٰ حضرت کے) خلف الصدق صورۃً مو بہ مو، سیرۃً ہو بہو، علم راسخ کے جبلِ شامخ اور صلاح و تقویٰ کے کوہ گراں، فرزند و خلیفۂ اعلیٰ حضرت یعنی حضور مفتی اعظم ہند مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خاں صاحب دامت برکاتہ العالیہ کو تمام فیوض و برکات کے ساتھ سُنّی دنیا پر برابر سایہ گستر رکھے۔'' ۲۱

سُنّی جمعیۃ العلما کی تاسیس عمل میں آئی۔ وہابی دیوبندی فرقوں کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی۔ بے بنیاد اعتراضات کی داغ بیل پڑگئی۔ محدث اعظم ہند نے ان کا احتساب فرمایا۔ اعتراضات کے مسکت جوابات دیے۔ اس ضمن میں حضور مفتی اعظم ہند کی شان بھی بیان کردی۔ سنیوں کے آقا کا تذکرہ کس انداز سے بیان کرتے ہیں:

''میرا خیال ہے سُنّی جمعیۃ العلما کیا چیز ہے؟ سطور بالا میں اس سوال کا مفصل جواب آچکا ہے۔ کاش! اس سوال کا جواب حضرت مفتی اعظم ہند، سُنیوں کا آقا، سُنیوں کا مرکزی آسرا کا قلم جواب دیتا۔'' ۲۲

امام احمد رضا محدث بریلوی سے روابط و تعلقات کی بہت سی جہتیں ہیں۔ راقم نے صرف بعض جہتوں سے اجمالی جائزہ لیا ہے۔ مزید تحقیق کی جائے تو کافی کچھ ذخیرہ ہاتھ آئے گا اور آنکھیں خیرہ ہوجائیں گی۔

مصادر:

(۱) محمد حسین بدر، حکیم، سات ستارے، کنزالایمان سوسائٹی آزاد کشمیر ۲۰۰۶ء، ص ۹۱

(۲) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، مجدد اعظم مشمولہ سنی آواز ناگپور، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۸۴

(۳) ایضاً، ص ۸۴۔۸۵

(۴) ایضاً، ص ۷۰

(۵) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، دین پرور ارشادات ۱۳۷۹ھ (خطبۂ صدارت) جماعت رضائے مصطفیٰ گجرات، ص ۸

(۶) ایضاً

(۷) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، منافقین اسلام کا آغاز و ارتقا، مشمولہ ماہ نامہ المیزان کچھوچھہ، اگست ۱۹۷۲ء، ص ۵۰

(۸) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، فرش پر عرش، رضوی کتاب گھر دہلی (س۔ن) ص ۱۳۲۔۱۳۳

(۹) مشتاق احمد نظامی، مولانا، عظیم قائد مشمولہ محدث اعظم ہند المیزان، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۶۴

(۱۰) محمد دین کلیم، محدث اعظم ہند اور لاہور مشمولہ محدث اعظم ہند نمبر المیزان، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۷

(۱۱) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، مجدد اعظم مشمولہ سنی آواز ناگپور، جولائی تا ستمبر ۱۹۹۷ء، ص ۶۱۔۶۲

(۱۲) ایضاً، ص ۶۷

(۱۳) ایضاً، ص ۶۸

(۱۴) ایضاً، ص ۶۹

(۱۵) ایضاً۔ ص ۷۱۔۷۲

(۱۶) ایضاً، ص ۷۵

نوٹ: علامہ محمد عبدالمبین نعمانی مصباحی نے حدیث اور اس کے متعلقہ فنون میں امام احمد رضا کی تصانیف و حواشی کی تعداد ۵۹ درج کی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

تصانیف امام احمد رضا، از علامہ محمد عبدالمبین نعمانی، مطبوعہ رضا اکیڈمی ممبئی

(۱۷) ایضاً، ص ۸۳۔۸۴

(۱۸) ایضاً، ص ۸۷

(۱۹) ایضاً، ص ۸۷۔۸۸

(۲۰) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، خطبہ بنارس کانفرنس مشمولہ محدث اعظم ہند نمبر المیزان، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۱۱۲

(۲۱) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، دین پرور ارشادات ۱۳۷۹ھ (خطبۂ صدارت) جماعت رضائے مصطفیٰ گجرات، ص ۱۲

(۲۲) سید محمد اشرفی کچھوچھوی، مولانا، دین پرور ارشادات ۱۳۷۹ھ (خطبۂ صدارت) مجلس استقبالیہ سنی کانفرنس مالے گاؤں، ص ۱۳
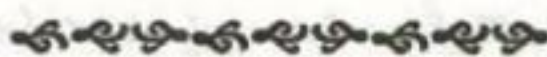
فنِ خطابت کے عصری تقاضے

از: ساحل شہسرامی (علیگ)، علی گڑھ
رضا اکیڈمی، محلہ منڈی کشور خان، شہسرام، بہار

خطابت' انسانی سماج کی ایک اہم ضرورت ہے اور دوسروں تک اپنی بات پہنچانے، انہیں اپنا ہم نوا بنانے اور قائل کرنے کا موثر ذریعہ۔ یہ فن انسان اپنے وجود کے ساتھ لے کر پیدا ہوا۔ اسلام کی تشریف آوری سے پہلے خطابت کا ملکہ عربوں کا سرمایۂ افتخار تھا اور سحبان بن وائل اس فن کا امام۔ اسلام کا پیغام عام کرنے میں خطابت نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ حضور نبی کریم ﷺ کے متعدد خطباتِ کریمہ یا اُن کے اجزا' احادیثِ طیبہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ بعد کے سبھی زمانوں میں مصلحینِ اُمّت نے فکروں کی اصلاح، دلوں کی تطہیر اور اخلاق کی تعلیم کے لیے خطابت کا سہارا لیا۔ اسلامی سطح پر بھی عیدین، جمعۂ مبارکہ، حج، نکاح اور جلسہ ہائے میلادالنبی میں خطابت کی شمولیت نے اس کی اہمیت ہمیشہ برقرار رکھی۔ اس لیے افادیت کے پیش نظر ان خطبات کو تحریری شکل بھی دی جانے لگی تاکہ موجودہ اور آیندہ نسلیں بھی ان سے مستقل فایدہ اُٹھاتی رہیں۔ ہر زبان میں اس قسم کے کثیر مجموعے مل جائیں گے۔ اردو زبان بھی ان سے مالا مال ہے۔

پہلے عموماً یہ ہوتا تھا کہ خطبات پیش ہونے کے بعد یا اسی محفل میں اصحابِ ذوق انہیں قلم بند کر لیتے تھے۔ سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مجلسِ وعظ میں چار چار سو افراد قلم دوات سنبھال کر بیٹھتے اور سرکار کے مبارک ارشادات قلم بند کرتے۔ بعد کے زمانوں میں مبتدیوں کی تعلیم کے لیے یہ رسم بھی چل نکلی کہ مختلف موضوعات پر طبع زاد خطباتی تحریریں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ یہ خطبات کسی محفل کی دین نہیں ہوتے بلکہ قلم کار اپنے کمرے میں بیٹھ کر ذہن و دماغ میں کسی محفل کا تصور سموتا اور پھر مختلف موضوعات پر بے تکان بولتا نہیں لکھتا چلا جاتا۔ اس طرز کے خطباتی مجموعے نو آموز مقررّین کے لیے بڑے مفید ثابت ہوئے۔ انہیں اپنے مطلوبہ موضوعات پر مواد بھی یکجا مل جاتا اور تقریر کے انداز اور بیان کے نشیب و فراز کی تلقین بھی ہو جاتی کہ کس جگہ کس انداز سے گفتگو کرنی ہے۔

کامیاب خطیب بننے کے لیے چند باتوں کی رعایت ضروری ہے:

☆ خطیب کو اندازِ بیان پر قدرت ہو، لب و لہجہ ایسا واضح ہو کہ سامعین دماغ پر زور ڈالے بغیر اس کی باتیں سمجھتے چلے جائیں۔ جو وہ کہنا چاہ رہا ہے الفاظ اس کی ترجمانی کرتے ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ آدھی بات کہے اور آدھی دل میں ہی رہ جائے۔ جو بات کہے اس کی معقول توجیہ اور واضح دلیل بھی بیان کرے تاکہ سامعین اس کی باتوں کے قائل بھی ہوتے چلیں۔

☆ گفتگو میں تسلسل، روانی اور متوازن جوش کی جھلک دکھائی دینی چاہیے ورنہ خطابت، خطابت نہ رہے گی بلکہ پند و نصیحت بن کر رہ جائے گی۔

☆ کسی بھی موضوع یا نکتے کو تمثیلات، بامعنی مترادفات، قصص و واقعات، برمحل اشعار سے دلچسپ بنانا چاہیے تاکہ سامعین پر اس کے بیان کا سحر طاری رہے اور وہ اس کے حصار گفتگو سے نکلنے نہ پائیں۔

☆ سامعین کے ذہن و دماغ کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے موقع کی رعایت بھی ضروری ہے جو بلاغت کا خاص اصول ہے۔ جہاں موقع اجمال کا ہے، وہاں تفصیل سے گریز ضروری ہے اور جہاں تفصیلی گفتگو کے خواہش مند ہوں، وہاں اجمالی گفتگو بے معنی ہے۔ سامعین کے فکری مزاج، علمی کیفیات کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔ دانش وروں کے طبقے میں اشاروں میں نکات پیش کیے جاتے ہیں۔ یہاں عوامی انداز کی گفتگو نہیں سُنی جائے گی اور جہاں عوام زیادہ ہوں وہاں علمی نکات بھی بہت وضاحت اور تفصیل کے ساتھ مثالوں کی روشنی میں پیش کیے جائیں گے۔

☆ علاقائی اور جغرافیائی مزاج کی معلومات بھی ضروری ہے۔ ہر جگہ ایک سا انداز نہیں چل سکتا۔ کہاں کس انداز سے گفتگو کا آغاز ہوتا ہے، مزاج ادبی ہے یا سادہ، کس حوالے اور نسبت سے گفتگو زیادہ باا ثر اور مفید رہے گی؟ اگر ان پہلوؤں پر بھی خطیب اپنی توجہ مرکوز رکھے تو اس کی گفتگو میں ہمہ گیر افادیت کا وصف پیدا ہوسکتا ہے۔ خطیب کو گفتگو کے ان دونوں رخ کا خوب علم ہونا چاہیے کہ کیا کہنا چاہیے اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔

☆ نو آموز خطیب کو چند اچھے جملے یا تقریریں یاد کرنی پڑسکتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ابتدا میں گلے بندھے انداز میں سلیقہ مند گفتگو کا طریقہ آتا ہے لیکن طرز خطابت پر گرفت حاصل ہوتے ہی رٹنے اور یاد کرنے کے انداز کو آہستہ آہستہ بالکل ترک کردینا چاہیے۔ اچھے جملے اور شائستہ گفتگو کے طریقے سیکھنے کے لیے شستہ اور ادبی تحریروں کا کثرت سے مطالعہ ضروری ہے۔ اس ذیل میں نسیم حجازی کے اسلامی ناول، اردو کے اعلیٰ ادبی دانش وروں اور رسائل کی تحریریں بہت کچھ دے سکتی ہیں۔ ان میں جو اچھے جملے نظر آئیں وہاں رُک کر انہیں چند بار دہرالیا جائے، انہیں گفتگو اور تحریروں میں استعمال کیا جاتا رہے تو زبان خود بخود نکھرتی چلی جائے گی۔

☆ اچھے خطیب کے لیے طرز بیان سے واقفیت کے ساتھ ساتھ معلومات کی وسعت بھی ازحد ضروری ہے۔ کیونکہ جب ذخیرۂ معلومات ہی نہ ہوگا تو وہ پیش کیا کرے گا؟ لفظوں میں جان' علم اور مطالعے کی وسعت سے ہی پڑتی ہے۔ بے جان لفظوں میں افادیت پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لیے اسلامی مصادر قرآن، تفسیر، حدیث، سیرت، اسلامی تاریخ، حالاتِ صحابہ، واقعاتِ بزرگاں، اقوالِ ائمہ، ملفوظاتِ صوفیہ، حکایاتِ اولیا کے ساتھ ساتھ صحیفۂ کائنات کا وسیع مطالعہ بھی ضروری ہے۔ زمانے کے رائج تمدنی، سیاسی، سماجی حالات کس رُخ پر جارہے ہیں۔ دنیاوی علوم کس انداز سے اپنے افکار کی اشاعت کررہے ہیں، جدید افکار کے چیلنج

کیا ہیں؟ ان معاملات سے بھی واقفیت ہونی چاہیے تا کہ زمانے کے نئے ذہنوں کو اسی انداز سے اسلامی تعلیمات کی تلقین کی جاسکے۔ اس کے لیے ملکی اور عالمی سطح کے معیاری اسلامی اور ادبی رسائل اور اخبارات کے مطالعے سے اپنی معلومات کو وسعت دی جاسکتی ہے۔ اخبارات اور ریڈیائی خبریں جدید حالات کو آسانی سے ہم تک منتقل کر دیتی ہیں۔ اسلامی اور ادبی مطالعے کا یہ سلسلہ جس قدر تسلسل کے ساتھ جاری رہے گا، اسی قدر خطابت نکھرتی جائے گی۔ ورنہ آج کل عموماً ایسا ہوتا ہے کہ خطابت کا سکہ چل جانے کے بعد خطیب اسلامیات اور ادبیات کے مطالعے سے خود کو بے نیاز سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ان کی باتیں مطلوبہ اثر نہیں چھوڑتیں۔

☆ خطابت میں ہاتھ، آنکھ اور دیگر اعضاے جسمانی کے اشارے بھی کام آتے ہیں۔ آواز کا اُتار چڑھاؤ بھی خاصا اثر ڈالتا ہے لیکن انہیں برتنے کا سلیقہ ہونا چاہیے۔ بے ڈول حرکات، بے تکی کرخت چیختی آوازیں باتوں کے ساتھ ساتھ خطیب کا اثر بھی کم کر دیتی ہیں۔ نو آموز طلبہ اپنے اندر متناسب زیر و بم پیدا کرنے، معتدل حرکات و سکنات کے آداب سیکھنے کے لیے معیاری خطیبوں کو اپنی آنکھوں سے منبر خطابت پر دیکھیں، سنیں، ان کی تقریروں کے کیسٹ سنیں اور ان کی ہو بہو نقل نہیں بلکہ ان کا عکس اپنے اندر اُتارنے کی کوشش کریں۔ ظرافت اور خوش طبعی اچھی چیز ہے کہ اس سے گفتگو میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے اور واعظانہ خشکی دور ہوتی ہے لیکن ظرافت کو اسی حد تک برتا جائے کہ اس میں مسخرہ پن کا انداز پیدا نہ ہونے پائے۔ متانت، وقار اور لطافت آمیز سنجیدگی خطیب اسلام کے بنیادی اوصاف ہیں جنھیں ہر خطیب کے اندر لازمی طور سے موجود ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ بندوں کے دل میں خدا کا خوف، رسول کی محبت اور دین کا پیغام سمونے کے لیے سامعین کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی ذمہ داری بڑی ہے اور منصب عظیم۔

☆ طبقۂ سامعین میں عموماً ہر معیار کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسلام جذبوں کا احترام سکھاتا ہے، اس لیے ترجمانِ اسلام کو بھی سامعین سے محترم طرزِ خطاب اپنانا چاہیے تا کہ ان کے دلوں میں احترام کے ساتھ عقیدت کے جذبات بھی موجزن ہوں۔ سنو، کہو، چلو جیسے الفاظ سے احتراز کرتے ہوئے آپ حضرات، حضراتِ سامعین اور کہیے جیسے معزز اندازِ تخاطب کو اپنانا چاہیے۔ یہی بزرگوں کی اسلامی روش ہے۔

☆ خطابت میں آج کل ''کہو سبحان اللہ'' ''کھل کر کہو سبحان اللہ'' وغیرہ سامعین سے کہلوانے کی ایک غیر متوازن رسم چل پڑی ہے۔ دانش مند طبقہ اسے استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھتا اور نہ یہ ہمارے بزرگوں کی روش ہے۔ سامعین کو ساتھ لے کر چلنا اچھی بات ہے۔ وعظ اور تفہیمی خطابت میں یہ ایک مفید طرزِ عمل ہے لیکن بیدار رکھنے اور سامعین کی توجہ کو ساتھ لے کر چلنے کی مذکورہ بالا منطق سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر اندازِ بیان دلچسپ ہو، سامعین کو مفید معلومات فراہم ہو رہی ہوں تو میں نہیں سمجھتا کہ سامعین کو اس طرز سے متوجہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس سلسلے میں میری نگاہ میں حضرت احسن العلما افضل الاصفیا مفتی سید شاہ حیدر حسن قادری برکاتی قدس سرہٗ کا طرزِ خطابت ہمارے خطبا کے لیے بہترین رہنما ہے۔

حضرت کی تقاریر کیسٹ میں بھی محفوظ ہیں اور تحریری شکل میں بھی یکجا طبع ہو چکی ہیں۔ ان کے مطالعے اور سماعت سے بزرگوں کا اندازِ خطابت کا فیض حاصل کیا جاسکتا ہے۔ درمیان میں درود شریف کے مبارک ورد سے بھی سامعین کی قلبی اور فکری یکسوئی کا سامان کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قادری برکاتی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مبارک طریقہ تھا۔

☆ بدمذہبوں کا رد کرنا علمائے اسلام کا اہم فریضہ ہے۔ یہ سُنّتِ الٰہیہ بھی ہے، سُنّتِ رسول بھی اور سُنّتِ صحابہ بھی۔ اگر بدمذہبی کی مذمت نہیں کی جائے گی اور اس کی خرابیاں عوام کو نہیں بتائی جائیں گی تو وہ خود کو ان نحوستوں سے کیسے محفوظ رکھ سکیں گے؟ لیکن اس ذیل میں یہ بات ملحوظ رکھنی ضروری ہے کہ ہر محفل اور ہر وعظ میں یہ اندازِ خطابت نہ موزوں ہے، نہ مطلوب۔ بسا اوقات معروضی انداز میں اپنے عقاید مدلل انداز سے پیش کردینے سے بھی وہ مقاصد حاصل ہو جاتے ہیں جو ردِّ بدمذہباں سے مقصود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر قرآن و حدیث، روایاتِ صحابہ اور اقوالِ بزرگاں کی روشنی میں سامعین کے سامنے یہ بات واضح کردی جائے کہ رسولانِ عظام، انبیائے کرام اور بزرگانِ دین کے وسیلے سے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دعا کرنا، ان بزرگوں سے مشکل اوقات میں مدد مانگنا جائز ہے تو کسی خاص فرقے کی تعیین کے بغیر ان تمام گروہوں کے افکارِ باطلہ کا ازخود ردّ ہوجائے گا جو محبوبانِ بارگاہ سے استعانت کو معاذ اللہ شرک اور بدعت کہتے ہیں۔ اس ذیل میں قرآن و حدیث کا متن پیش کردینے سے بات اور زیادہ وزن دار، بابرکت اور پُر اثر ہوجاتی ہے۔ نو آموز طلبہ اور نو فارغ علما کو اس سمت میں خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ جاء الحق اور معمولاتِ اہلِ سُنّت جیسی کتابوں کا مطالعہ اس سلسلے میں ان کی مفید راہنمائی کرے گا۔

☆ اسلامی خطابت میں موضوع چاہے جو کچھ بھی ہو، اس کا ایک حصہ ایسی باتوں پر ضرور مشتمل ہونا چاہیے جن کو سُن کر حاضرین کے دلوں میں خوفِ الٰہی اور عشقِ رسالت پناہی کی لہریں اُٹھتی ہوئی نظر آئیں۔ کیونکہ اسلامی خطابت کا خاص مقصد ہی ہوتا ہے کہ دنیا کے غافل انسان خطیب کی باتیں سُن کر خود کو اپنے رب کے حضور محسوس کریں۔ ایک بزرگ نے ولی کی پہچان یہ بتائی ہے کہ اُسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔ سچے اسلامی خطیب کی پہچان بھی یہی ہونی چاہیے کہ اس کی باتیں سُن کر خدا یاد آئے۔

☆ خلوص اور فکری طہارت بھی بااثر اسلامی خطابت کا لازمی جزو ہے۔ ان کے بغیر باتوں میں اثر پیدا نہیں ہوتا۔ خطابت کا دلی مقصد بھی دعوت الی الحق، فریضۂ اسلامی کی ادائیگی اور رضائے الٰہی، خوش نودیِ مصطفوی کی طلب ہونی چاہیے۔ دنیا کمانا، زورِ بیان دکھانا، واہ واہی لوٹنا دنیا کے بازی گروں کے مقاصد ہوتے ہیں، اسلامی خطیبوں کے نہیں۔ مولیٰ عزوجل ہمیں اپنی مرضیات کی توفیق عطا فرمائے اور مغضوبات سے دور رکھے۔ آمین بجاہ النبی الامین علیہ اکرم الصلوٰۃ وافضل التسلیم!

کیا مرقدِ عیسیٰ (علیہ السلام) کشمیر میں؟

تحقیق وتنقید: نوشاد عالم چشتی

اے، ایم یو علی گڑھ۔ یو پی

اسلام اور عیسائیت کے درمیان بہت سارے شدید اختلاف کے باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت نہایت محترم اور قابلِ تعظیم ہے۔ الہامی کتابوں کے حامل ادیانِ سماویہ میں اسلام وہ واحد دین مبین ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سلسلۂ نبوت کی ایک اہم کڑی تسلیم کرتا ہے۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو ''ابن اللہ'' کے طور پر ''اقانیم ثلاثہ'' پر مشتمل ''الوہیت'' کا ایک اہم جز مانتے ہیں۔ اس کے برعکس مذہب یہودیت کے پیروکار حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے انتہائی سخت بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے ہیں۔ بلکہ آپ کی ذاتِ مقدسہ پر نہایت غلیظ قسم کے الزامات لگا کر ہمہ وقت کیچڑ اُچھالنے کا دائمی وطیرہ اپنا رکھا ہے۔ حیاتِ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہر باب کا ایک ایک ورق کھول کھول کر پڑھ جایئے، ان فتنہ پرور لوگوں کی سازشوں کا اندازہ لگ جائے گا۔ آپ نے جب قومِ بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کو حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مقدس تعلیمات سے انحراف کرتے اور اس کے برعکس عمل پیرا ہوتے دیکھا تو اپنے فرائضِ منصبی کو پورا کرنے اور اتمامِ حجت کے لیے انھیں توریت کی حقیقی تعلیماتِ الٰہیہ کی طرف پھر سے بلانا شروع کیا تو نتیجتاً یہ باغیِ حق اور سرکش لوگ آپ کو جان سے مارنے کے درپے ہوگئے۔ بائبل کے مطابق جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہودیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

'اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ انسان تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تونے بھیجا ہے جانیں۔'' [1]

ایک جگہ اور آپ ارشاد فرماتے ہیں:

''خدا ایک ہے، اور خدا اور انسانوں کے بیچ میں درمیانی بھی ایک یعنی یسوع مسیح جو انسان ہے۔'' [2]

مگر جب ان یہودیوں کی یہ سرکشی حد سے زیادہ بڑھ گئی تو آپ نے مزید انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہا:

''اگر تم ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی اولاد ہوتے تو (حضرت) ابراہیم کے اعمال سر انجام دیتے۔ لیکن اب تم مجھے جو کہ ایک آدمی ہے، مار ڈالنے کے درپے ہو۔ جس نے تمھیں سچائی بتلائی۔ جو کہ اُس نے خداوند سے سُنی۔'' [3]

متی جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے ایک حواری ہیں، انھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک قول یوں بھی نقل کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

"یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتاب منسوخ کرنے آیا ہوں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔"[۲]

مذکورہ بالا اقتباسات سے جہاں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی قلبی کیفیات کا پتہ چلتا ہے وہیں اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ یہودیوں نے آپ کے قتل کا پورا پورا منصوبہ تیار کرلیا تھا۔ جیسا کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مذکورہ بالا اقتباس میں اس خدشے کا خود ہی اظہار فرما دیا ہے۔ موجودہ عیسائیت کے پرستاروں اور دینِ اسلام کے پیروکاروں کا اس امر پر کامل اتفاق ہے کہ یہودیوں کے سرکردہ افراد نے قتلِ مسیح (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا پورا پورا منصوبہ بنا کر مکمل انتظام کرلیا تھا۔ لیکن مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اس بات میں شدید اختلاف ہے کہ آیا یہودی قتلِ مسیح کے اس ناپاک ارادے میں کامیاب ہوئے یا نہیں؟ اس ضمن میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کا متفق علیہ متوارث عقیدہ یہ ہے کہ یہودی قتلِ مسیح کے باب میں ہرگز ہرگز کامیاب نہیں ہوئے۔ لیکن موجودہ مذہب عیسائیت کے پیروکاروں کا کہنا ہے کہ قتلِ مسیح میں یہودی کامیاب ہوگئے۔ اور حضرت عیسیٰ مسیح (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ان ظالموں کے ہاتھوں (معاذ اللہ) "مصلوب" ہوکر سولی پر اپنی جان دیدی اور عیسائی عقیدے کے مطابق ان کے "گناہوں" کا "کفارہ" بن گئے۔ اس طرح مذہب عیسائیت میں "عقیدۂ مصلوبیت" اور "عقیدۂ کفارہ" نہایت اہم اور بنیادی حیثیت کے حامل ہیں۔ اور جب تک ہم عیسائیت کے یہ دو بنیادی عقاید "مصلوبیت" اور "کفارہ" کو سمجھ نہ لیں اس وقت تک نفس موضوع یعنی "کیا مرقدِ عیسیٰ علیہ السلام کشمیر میں؟" کی وضاحت نہایت مشکل ہے۔ لیکن میرا موضوع دینی حیثیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت کا بھی حامل ہے۔ اور میں یہاں تاریخی اعتبار سے بحث کروں گا۔ ہاں دینی اعتبار سے گفتگو بقدرِ ضرورت کی جائے گی۔ لیکن اختصار کے ساتھ سب سے پہلے ہم یہ جانیں کہ عیسائیت کے نزدیک "عقیدۂ مصلوبیت" اور "عقیدۂ کفارہ" کیا ہے۔

۱۔ **عقیدۂ مصلوبیت:** اس عقیدے کے متعلق محترم محمد شریف قریشی صاحب لکھتے ہیں:

"حضرت عیسیٰ مسیح کا مصلوب ہونا مذہب مسیحیت کا ایک اہم واقعہ ہے اور اس واقعہ پر ہی "عقیدۂ کفارہ" کا انحصار ہے۔ اناجیل اربعہ کے بیان کے مطابق دعوئ مسیحیت کے سبب یسوع مسیح (حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ ناقل) کو یہودیوں نے ان کے خاص شاگرد (حواری یہوداہ اسکریوتی) کے ذریعہ تیس ۳۰ روپیہ رشوت دیکر گرفتار کیا۔ حضرت مسیح کو پہلے یہودی سرداروں کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اور انھیں کفر کے الزام میں لائق قتل سمجھا گیا۔ اس کے بعد یہودیوں نے رومی عدالت میں حضرت مسیح کو پیش کیا۔ جہاں پنطیس پیلد طوس حاکم تھا جو کہ یروشلم کا گورنر تھا۔ چنانچہ سولی کی سزا کا حکم ہوا، اور کوہ کلوری (جو کہ یروشلم کے مغرب میں ہے جسے گلگتا یعنی کھوپڑی پہاڑ بھی کہتے ہیں) پر مصلوب ہونے سے پیشتر بڑی ذلت وخواری کے ساتھ پھانسی گھر لائے گئے تھے۔ جہاں انھیں کانٹوں کا تاج پہنایا

گیا تھا۔ ان پر تھوکا گیا۔ گندے فقرے چست کیے گئے۔ پھر سولی کی جگہ کھڑا کر کے ان کے دونوں ہاتھوں میں میخیں گاڑ دی گئیں، گویا صلیب دیدیا گیا۔" [۵]

"عقیدۂ مصلوبیت" کے متعلق شریف صاحب کی یہ نہایت مختصر اور جامع تشریح آپ نے ملاحظہ کی۔ جو تقریباً تمام کتب عیسائیت کا نچوڑ ہے۔ اس کی تفصیل دیکھنی ہو تو انجیل یوحنا کے باب ۱۸ اور باب ۱۹ کا مطالعہ کریں۔ عقیدۂ مصلوبیت کو انگریزوں میں "Crucifixion" بھی کہتے ہیں۔

۲۔ عقیدۂ کفارہ: دنیائے عیسائیت کے نزدیک حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کا مصلوب ہونا بلاوجہ نہیں بلکہ ابن آدم کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا تھا۔ [۶] بشرطیکہ وہ مسیح پر ایمان رکھتا ہو۔ کفارہ سے مُراد حضرتِ مسیح کی وہ قربانی ہے جس پر ایمان لانے سے ایک گناہ گار انسان یک لخت خدا کی رحمت سے قریب ہو جاتا ہے اور گناہوں سے نجات پا جاتا ہے۔ عیسائیت کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح نہ صرف بنی آدم کے گناہ کے کفارہ کے لیے سولی پر وفات پا گئے بلکہ وہ اپنی قبر میں دفن ہونے کے تیسرے دن بعد پھر دوبارہ زندہ بھی ہو گئے اور اپنے حواریوں کو مختلف ہدایات دینے کے بعد آسمان پر تشریف لے گئے۔ انجیل لوقا کے مطابق:

"مسیح دُکھ اُٹھائے گا اور تیسرے دن مُردوں میں سے جی اُٹھے گا۔" [۷]

اعمال کے مطابق:

"اُس نے دکھ سہنے کے بعد بہت سے ثبوتوں سے اپنے آپ کو اُن پر زندہ ظاہر بھی کیا۔
چنانچہ وہ چالیس دن تک اُنہیں نظر آتا اور خدا کی بادشاہی کی باتیں کہتا رہا۔" [۸]

"یہ کہہ کر وہ اُن کے دیکھتے دیکھتے اُوپر اُٹھا لیا گیا اور بدلی نے اُسے اُن کی نظروں سے چھپا لیا۔" [۹]

عہد نامہ جدید کی ان مذکورہ بالا آیات کی روشنی میں دنیائے عیسائیت کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح بنی آدم کے گناہ کے "کفارہ" کے لیے صلیب پر وفات پا گئے۔ موت کے بعد قبر میں دفن بھی کیے گئے۔ اپنی موت کے تین دن بعد پھر دوبارہ زندہ ہو کر اپنے حواریوں سے ۴۰ دن تک ملاقات بھی کرتے رہے اور پھر اس کے بعد آسمان پر تشریف لے گئے۔

لیکن اس کے برعکس مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کو جب پھانسی کے لیے یہودیوں نے کوٹھری میں بند کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے انھیں آسمان کی طرف اُٹھا لیا۔ اور جو شخص کوٹھری میں آپ کی نگہداشت کے لیے گیا، اُسے مسیح کا ہم شکل کر دیا۔ باہر والوں نے اُسے مسیح سمجھ کر سولی پہ لٹکا دیا۔ جبکہ وہ شخص بار بار اپنے کو اصل مسیح ہونے سے انکار کرتا رہا۔ لیکن لوگ اپنی جنونی کیفیت میں اصل حقیقت سے بے خبر رہے مگر جب بعد میں اپنے احباب میں سے ایک کی تعداد کم پائی تو خود بھی حیرت و استعجاب اور اشتباہ میں پڑ گئے۔ قرآن کریم نے اُن لوگوں کی اس کیفیت کا بیان اس طرح کیا ہے:

وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ

وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۝ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا ۝ وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ ۖ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكُونُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا ۝

(النساء۔ آیت ۱۵۶۔۱۵۹)

ترجمہ: اور ان کے اس کہنے پر کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم اللہ کے رسول کو شہید کیا۔ اور ہے یہ کہ انہوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ انھیں سولی دی بلکہ ان کے لیے اُس کی شبیہ کا ایک بنا دیا گیا۔ اور وہ جو اس کے بارے میں اختلاف کر رہے ہیں ضرور اس کی طرف سے شبہہ میں پڑے ہوئے ہیں انھیں اس کی کچھ بھی خبر نہیں۔ مگر یہی گمان کی پیروی اور بیشک انھوں نے اس کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اسے اپنی طرف اُٹھا لیا اور اللہ غالب حکمت والا ہے کوئی کتابی ایسا نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لائے اور قیامت کے دن وہ ان پر گواہ ہوگا۔

قرآنی آیات کی روشنی میں جملہ اہلِ اسلام کا بنیادی عقیدہ حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق یہ ہے کہ نہ تو آپ مصلوب ہوکر پھانسی کی موت مرے اور نہ دفن کیے گئے اور نہ ہی تین دن کے بعد دوبارہ زندہ ہوکر چالیس دن تک اپنے احباب کو دکھائی دیتے رہے۔ بلکہ آیات و آثار کی تشریحی روشنی میں مسیح علیہ الصلوٰۃ والتسلیم زندہ ہی آسمان کی طرف اُٹھا لیے گئے۔ قربِ قیامت نزول فرمائیں گے اور عام اہلِ کتاب آپ پر ایمان لاکر ابدی نجات کے مستحق ہوں گے۔

اہلِ اسلام اور عیسائیت کے درمیان ''عقیدۂ مصلوبیت'' اور ''عقیدۂ کفارہ'' ہی ابھی باعثِ نزع بنا ہوا تھا کہ انگریزوں کے خود کاشتہ پودا اور نومولود قادیانی فرقہ کے بانی و امام (جنھوں نے خیر سے دعوائے نبوت بھی کیا) متنبّی مرزا غلام احمد قادیانی نے حضرت مسیح کے متعلق جملہ اہلِ اسلام سے ہٹ کر اپنے پیروکاروں کو ایک نیا عقیدہ دیا اور وہ نیا عقیدہ ''وفاتِ مسیح'' کے نام سے مشہور ہوا۔ فی الحال مجھے یہاں مکمل طور سے قادیانیت کی تاریخ بتانا مقصود نہیں بلکہ قادیانی جماعت کا موقف ''وفاتِ مسیح'' کے متعلق کیا ہے، اس سے قارئین کو روشناس کرانا پیشِ نظر ہے۔ چونکہ مسلمانوں کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور قربِ قیامت آسمان سے نزول فرمائیں گے۔ ساتھ ہی آں حضورﷺ خاتم النبیین اور سب سے آخری نبی ہیں۔ لہٰذا اب کوئی دوسرا نیا نبی نہیں آئے گا۔ یہ اُمتِ مسلمہ کا متفق علیہ اور اجماعی مسئلہ ہے۔ لیکن دورِ استعمار میں متنبّی مرزا غلام احمد قادیانی صاحب نے اپنی خود ساختہ ''دینی خدمات'' کی بدولت سب سے پہلے ''دعوائے مجددیت'' کی دہلیز پہ قدم رکھا۔ پھر حسبِ ضرورت مختلف ''عہدوں'' کو اپنے ''وجودِ مسعود'' سے شرف بخشتے ہوئے ''دعوائے نبوت'' کی منزل پہ متمکن ہوئے۔ ''مجددیت'' سے ''نبوت'' تک کے سفر میں مرزا صاحب نے ''مصلح''، ''مثیلِ مسیح'' اور ''مہدیٔ موعود'' نامی مقامات پر بھی کچھ دنوں کے لیے عارضی پڑاؤ ڈالا۔ چونکہ

مرزا صاحب کو حصولِ مقصود کے لیے ایک لمبی مسافت طے کرنی تھی۔ لہٰذا ان مقامات پہ عارضی قیام مرزا صاحب کی ضرورت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ کیونکہ بہت تیزی کے ساتھ رائے عامّہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا مرزا صاحب کے لیے نہایت دشوار اور خاصا مشکل امر تھا۔ مرزا صاحب نے جب "مثیلِ مسیح" اور "مہدیٔ موعود" کا دعویٰ کیا تو برِ صغیر میں عموماً اور صوبۂ پنجاب میں خصوصاً مسلمانوں کے درمیان ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ مرزا صاحب نے مثیلِ مسیح کے مقام پر خود کو فائز کرنے کے لیے "وفاتِ مسیح" کا عقیدہ بھی وضع کیا۔ اس کے لیے انھوں نے آیۂ کریمہ "یَا عِیسَیٰ اِنِّی مُتَوَفِّیکَ ☆ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ۔" [۱۱] کا سہارا لیا [۱۲] اور اپنی تصنیفات میں ثابت کیا کہ حضرت عیسیٰ وفات پا چکے ہیں، اب وہ ہرگز دنیا میں دوبارہ نہیں آئیں گے۔ مرزا صاحب نے نہ صرف وفاتِ عیسیٰ (علیہ السلام) ہی کو ثابت کیا بلکہ کشمیر میں حضرت عیسیٰ کی قبر کی (بزعمِ خود) نشان دہی بھی کر دی۔ اور اس طرح اس دینی مغالطہ کو تاریخی مغالطہ میں تبدیل کر دیا۔ مرزا صاحب نے اپنے موقف کی حمایت میں لگ بھگ ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب "مسیح ہندوستان میں" ۱۹۰۸ء میں رقم کی۔ مذکورہ بالا کتاب کی اشاعتِ ثانی کے پیش لفظ میں مرزا وسیم احمد قادیانی لکھتے ہیں:

> "حضرت "مسیح موعود علیہ السلام" کی تصنیف "مسیح ہندوستان میں" حتی المقدور پوری صحت کے ساتھ احبابِ جماعت کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس تصنیف میں حضور نے حضرت مسیح ناصری علیہ السلام کے صلیب سے زندہ اُتر آنے اور پھر کشمیر کی طرف ہجرت کرنے اور عمرِ طبعی پانے کا ایسے زبردست عقلی و نقلی دلائل سے ثبوت دیا ہے کہ ایک محقق کو آپ کا نظریہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔
>
> باب اوّل: مسیح کے صلیبی موت سے بچنے پر انجیلی دلائل
>
> باب دوم: ان شہادتوں کے بیان میں جو حضرت مسیح کے صلیبی موت سے بچ جانے کی نسبت قرآن و حدیث سے ملتی ہیں۔
>
> باب سوم: اُن شہادتوں کے بیان میں جو طبّ کی کتابوں سے ملتی ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب سے زندہ اُتر آئے۔ اور اُن کے زخموں کے لیے مرہم بنائی گئی جس کا نام مرہم عیسیٰ تھا۔
>
> باب چہارم: اُن شہادتوں کے بیان میں جو تاریخی کتابوں سے لی گئی ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے واقعۂ صلیب کے بعد اپنے ملک سے ہندوستان کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر آتا ہے۔ اس باب میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے ثابت کیا ہے کہ مسیح کی کھوئی ہوئی بھیڑیں کشمیر اور افغانستان میں آباد تھیں۔ اور ان ممالک کے باشندے اسرائیلی ہیں۔ کتاب میں حضور نے یروشلم سے سری نگر پہنچنے کا نقشۂ سفر بھی دیا ہے۔" [۱۳]

موجودہ قادیانیت کے جانشین اور لندن میں پناہ گزیں مرزا ناصر قادیانی نے ''وفاتِ مسیح'' کے متعلق ۱۷؍اپریل ۱۹۸۵ء کو لندن میں تقریر کرتے ہوئے بہت جارحانہ اندازِ خطابت اختیار کیا، کہتے ہیں:

''اگر جماعتِ احمدیہ کو مارنا ہے تو دس یا سو یا ہزار آدمیوں کو مارنے سے جماعت نہیں مرے گی۔ ایک آدمی کو زندہ کرکے دکھادو! ساری جماعت مرجائے گی وہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ اتنا لمبا جھگڑا ہوگیا۔ سو سال ہوگئے۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور آج سے سو سال پہلے اس سے بھی پہلے تمہارے علماء کہتے ہیں، تم تباہ حال ہوچکے ہو۔ اسلام کا نام و نشان تم میں باقی نہیں۔ عیسیٰ بیٹھے کر کیا رہے ہیں اوپر؟ اُترتے کیوں نہیں؟ احمدیوں کو مارنے کی بجائے ایک مَرے ہوئے کو زندہ کرکے دکھا دو اور مَیں جماعتِ احمدیہ کی طرف سے چیلنج دیتا ہوں تمہیں اس بات پہ جھگڑا ختم ہوجاتا ہے۔ اگر حضرت عیسیٰ کو تم نے زندہ اُتار دیا تو خدا کی قسم مَیں اور میری ساری جماعت سب سے پہلے بیعت کرے گی۔ مَیں اس خدا کی عزت و جلال کی قسم کھاکر کہتا ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اور تمام احمدیوں کی جان ہے کہ اگر واقعتاً عیسیٰ زندہ ہے اور ہم جھوٹے ہیں تو وہ ہم سب کو ہلاک کردے۔ اور نیست و نابود کردے۔ مگر خدا کی قسم عیسیٰ مرچکا ہے۔ اور اسلام زندہ ہے۔'' [۱۲]

حضرت مسیح، کشمیر اور مؤرخین: وفاتِ مسیح کے موضوع پہ ایک اور قادیانی مصنف جناب جے. ڈی. شمس کی انگریزی کتاب لائقِ مطالعہ ہے جس کا نام "Where did Jesus die?" ہے۔ انھوں نے وفاتِ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کی قبر سری نگر، کشمیر میں ثابت کرنے کے لیے پوری توانائی صرف کردی۔ علاوہ ازیں ایک اور انگریزی کتابچہ "Jesus in Kashmir" میں بھی قادیانیت کی طرف سے اسی طرح کا اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ لیکن کشمیر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات اور سری نگر میں حضرت کی قبر ہونے کی اس قادیانی موقف سے اکثر و بیش تر مورخین کا طبقہ ناقابلِ تردید دلائل کی روشنی میں سخت اختلاف کرتا ہے۔ مرزا صاحب کے دلائل کا جائزہ لیتے ہوئے ایک مورخ جناب مرزا شفیق حسین صاحب رقم طراز ہیں۔

''قادیانی حضرات نے بھی اپنے مخصوص عقاید کے پیشِ نظر کشمیر کی وجہِ تسمیہ کے متعلق اپنی ایک الگ حکایت وضع کرلی ہے۔ مرزا غلام احمد کی تحقیق کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا انتقال کشمیر میں ہوا۔ اور وہ سری نگر کے محلہ خانیار میں مدفون ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کشمیری زبان میں لفظ ''کشمیر'' کا تلفظ ''کشیر'' ہے۔ جو دراصل ایک عبرانی لفظ ہے۔ یہ لفظ دو الفاظ یعنی ''ک'' (جو مماثلت و تشبیہ کے لیے استعمال ہوتا ہے) اور ''اشیر'' (جس کے معنی عبرانی زبان میں ''شام'' کے ہیں) کا مرکب

ہے اور اس کا مطلب ''شام کی مانند'' ہے۔ مرزا صاحب کے بقول جب عیسیٰ علیہ السلام نے فلسطین سے ہندوستان کے اس علاقہ کی طرف ہجرت کی جو اپنی آب و ہوا کی خوبی، موسم کی خوش گواری اور سرسبزی و شادابی میں ملک شام سے بہت مشابہ ہے تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو تسلی دینے اور اُن کا دل خوش کرنے کے لیے اس علاقہ کا نام ''کشمیر'' رکھ دیا۔'' [۱۵]

مرزا شفیق حسین صاحب مزید مرزا غلام احمد قادیانی کے دلائل کا ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی مفروضہ آمد کی نسبت کیشپ رشی کا واقعہ قدیم تر ہے اور اس وادی کا نام عیسوی سن سے بہت پہلے سے ہی کشمیر ہے لہٰذا یہ کہنا کہ کشمیر یا کشمیر، سیریا (Syria) کا ہم نام یا ہم شکل ملک ہے، دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے اور سیریا تو شام کو مغربی ملکوں کے لوگ کہتے ہیں جب کہ اورینٹل زبانوں میں اس کو شام کہا جاتا تھا۔

مرزا غلام احمد نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے کشمیر میں ہی وفات پائی۔ اور سری نگر کے محلہ خانیار میں جو قبر ''یوز آسف'' کی قبر سے مشہور ہے وہ حضرت مسیح ہی کی ہے۔ مرزا صاحب کے اس دعویٰ کی کئی طرح سے تردید ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ ملک شام سے مشابہت کی دلیل بہت کمزور ہے۔ کیونکہ شام اور کشمیر کی آب و ہوا وغیرہ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے حضرت عیسیٰ کی کشمیر آمد کا قصہ ہی فرضی ہے۔ اور بفرضِ محال اگر یہ واقعہ کشمیر کی وجہ تسمیہ بھی ہو تب بھی یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ لفظ کشمیر حضرت عیسیٰ کی مبینہ کشمیر آمد سے بہت پہلے مستعمل تھا۔ صوفی غلام محی الدین نے The Ancient Geography of Kashmir pp.61-62 کے حوالے سے لکھا ہے کہ لفظ کشمیر کا استعمال ۲۳ صدیوں سے ثابت ہے۔ جبکہ یہ نام بذات خود اس سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔'' [۱۶]

قادیانی مصنف جے. ڈی. شمس (J. D. Shams) لکھتے ہیں:

"For a good many years there have been aflot in this land rumours that Christ did not realy die upon cross but was down and disappeared to seek the lost tribes, that he came to Kashmir, Ladakh and little Tibet and died and was buried in Srinagar." [۱۷]

ترجمہ ہے: کچھ سال پہلے یہ افواہیں گردش کررہی تھیں کہ عیسیٰ کا صلیب پر انتقال ہوا۔ اور وہ اُتر کر اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں غائب ہوگئے۔ پھر وہ کشمیر، لداخ اور تبت سے گذرے۔ فوت ہوئے اور سری نگر میں مدفون ہوئے۔

مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے خلفا و اُمتیوں نے اپنی بہت سی تصنیفات میں حضرت عیسیٰ علیہ

السلام کے متعلق یہ تاریخی مغالطہ دیا ہے۔ مثال کے طور پر مرزا صاحب لکھتے ہیں:

''جو سری نگر محلہ خانیار میں یوز آسف کے نام سے قبر موجود ہے وہ درحقیقت بلاشک وشبہ حضرت عیسیٰ کی قبر ہے۔'' ۱۸

''اور ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شاہزادہ نبی کہلاتا تھا۔ اسی کی قبر محلہ خانیار میں ہے جو یوز آسف کی قبر کر کے مشہور ہے۔'' ۱۹

مرزا بشیر احمد صاحب لکھتے ہیں:

''آخر کار مسیح کی قبر بھی سری نگر محلہ خانیار میں مل گئی۔ اس قبر کے متعلق بھی لوگوں سے دریافت کیا گیا تو یہی معلوم ہوا کہ یہ اُسی یوز آسف کی قبر ہے جو انیس سو سال ہوئے کشمیر میں آیا تھا۔ وہ قبر اور اس کے ساتھ والی مسیح کی ماں کی قبر ٹھیک اسی طرز پر ہیں جس طرح بنی اسرائیل کی قبریں ہوتی ہیں۔'' ۲۰

مرزا صاحب قادیانی کے ایک اُمتی محمد اسماعیل صاحب کشمیر کی ایک مشہور ومعروف مجذوبہ محترمہ للہ عارفہ کے متعلق لکھتے ہیں:

''معلوم ہوتا ہے حضرت مریم صدیقہ کشمیر میں للہ دوی (للہ بی بی) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ نام آپ کا عبرانی کی (الماہ) سے بگڑ کر بنا ہے۔ عبرانی میں الماہ جوان عورت کو کہا کرتے ہیں۔'' ۲۱

مرزا صاحب کی تاریخ دانی: مرزا صاحب اور اُن کے متبعین نے اپنے موقف کی حمایت کے لیے جس بنیاد کا سہارا لیا ہے وہ ''تاریخ اعظمی'' کی مندرجہ ذیل عبارت ہے۔ (جس کا مرزا صاحب اور دیگر قادیانی نواز صاحبان نے حصولِ مطلب کے لیے اپنا خود ساختہ ترجمہ کیا ہے)

''در عوام مشہور است کہ آنجا پیغمبرے آسودہ است کہ در زمانہ سابقہ در کشمیر مبعوث شدہ۔ در کتابے دیدہ ام کہ بعد از قصۂ دور و دراز حکایتے می نویسد کہ یکے از سلاطین زادہ براہ زہد وتقویٰ آمدہ ریاضت وعبادت بسیاری کرد بر سالت مردم کشمیر مبعوث شد۔'' ۲۲

ترجمہ: عوام میں مشہور ہے کہ اس جگہ ایک پیغمبر آسودۂ خاک ہیں جو گزشتہ زمانے میں کشمیر میں مبعوث تھے، میں نے ایک کتاب میں م دیکھا ہے دور و دراز کے قصبے سے یہ حکایت، لکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ زادہ نے زہد وتقویٰ کا راستہ اختیار کیا۔ عبادت وریاضت بہت کرتا تھا، کشمیریوں کے درمیان رسول بنا کر بھیجا گیا۔

فارسی عبارت کا انگریزی ترجمہ جے ڈی شمس J.D.Shams نے یوں کیا ہے:

"The tomb next to that of Sayyed Nasr-ud-Din is

generally known as that of a prophet who was sent to the inhabitants of Kashmir, and the place is known as the shrine of a prophet. He was a prince who came to Kashmir from a foreign land. He was perfect in piety, righteousness and devotion, he was made a prophet by God and was engaged in preaching to the Kashmiris. His name was Yus Asaf." (p. 82) Yus Asaf in Hebrew means Jesus the Gatherer." ۲۳

قادیانی مغالطہ اور مؤرخین کا ازالہ: یوز آسف کی قبر کے متعلق متنبی مرزا صاحب قادیانی اور دیگر قادیانی امت کے افراد نے جو تاریخی مغالطہ دیا ہے اس کا نہایت علمی اور تحقیقی ازالہ ''نگارستانِ کشمیر'' کے مصنف و مؤرخ جناب قاضی ظہور الحسن ناظم صاحب نے کیا ہے۔ ناظم صاحب نے اپنی تاریخی کتاب ''نگارستانِ کشمیر'' میں لگ بھگ ۲۰ صفحات پر مشتمل اس موضوع پر اپنی تحقیق کو پیش کیا ہے۔ مؤرخ نے قرآن و احادیث (کتب صحاح ستہ)، فتح الباری، کنزالاعمال اور میزان الاعتدال (جلد سوم) کے علاوہ جن کتب تواریخی کو اپنا مآخذ بنایا ہے ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ تاریخِ کشمیر۔ ملا عبدالوهاب شائق ۱۷۵۵ء
۲۔ للہ عارفہ
۳۔ اسرار الابرار
۴۔ تاریخ اعظمی
۵۔ تاریخ کبیر کشمیر
۶۔ بہارِ کشمیر۔ پنڈت پران ناتھ ایم.ایس.سی، پروفیسر دیال سنگھ کالج، لاہور
۷۔ گلدستۂ کشمیر
۸۔ رسالہ حالات یوز آصف۔ مولوی محمد شاہ سعادت
۹۔ گلشنِ کشمیر
۱۰۔ تاریخ سلمان باغ
۱۱۔ تاریخ طبری
۱۲۔ وفاء الوفا
۱۳۔ یوز آسف و بلوہر مطبع شمسی
۱۴۔ تنبیہ الغافلین مطبع صبح صادق
۱۵۔ اکمال الدین، بابویہ قمی شیعہ

۱۶۔ تحائف الابرار

۱۷۔ فہرست ابن ندیم

۱۸۔ کتاب السنۃ مشرقیہ

۱۹۔ اخوان الصفا

۲۰۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اتھکس

۲۱۔ تذکرۃ الاولیا۔ سائمون میٹا فراسٹ

۲۲۔ بدھسٹ برتھ اسٹوریز

۲۳۔ الفہرست

۲۴۔ مسعودی

۲۵۔ جاتکا

۲۶۔ تاریخ اسرار الاخیار

مصلوبیتِ مسیح کے متعلق انجیلی تضاد کو واضح کرنے کے لیے عہد نامہ جدید کی جن کتب کی آیات سے استدلال کیا ہے اُن کی فہرست حسب ذیل ہے:

۱۔ متی: ۳۲/۲۶، ۵۶/۲۶، ۴۸/۲۶، ۲۲/۲۷، ۳/۲۷

۲۔ مرقس: ۳۳/۱۴، ۲۳/۱۴، ۲۱/۱۵

۳۔ لوقا: ۲۲/۲۲، ۲۳/۲۲، ۲۲/۲۲،۲۷، ۳۶/۲۲

۴۔ یوحنا: ۱۵/۸، ۹/۱۷

۵۔ رسولوں کے اعمال: ۱۸/۱

۶۔ عبرانیوں کے نام کا خط: ۷/۵

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت، وفات اور قبر کے متعلق فکرِ قادیانیت کے باہمی تضاد کو واضح کرنے کے لیے حسب ذیل قادیانی کتب و رسائل کا سہارا لیا ہے:

۱۔ اعجاز احمدی

۲۔ اتمام الحجۃ

۳۔ حقیقۃ الوحی

۴۔ رازِ حقیقت

۵۔ ضمیمہ براہین احمدیہ

۶۔ رسالہ تشحیر الاذہان

۷۔ محقق

۸۔ نعم الوکیل

۹۔ مراۃ الحقائق

۱۰۔ القول المحمود فی شان الموعود

۱۱۔ عسل مصطفےٰ

۱۲۔ ازالۂ الاوہام

۱۳۔ تقطیع کلاں

۱۴۔ التنقید

۱۵۔ چشم مسیحی

۱۶۔ کشف الاسرار

۱۷۔ البدر ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۷ء

۱۸۔ الحکم ۱۹۰۶ء، ۱۹۰۷ء

۱۹۔ فاروق ۱۹۲۶ء

۲۰۔ ریویو آف ریلیجنز، جولائی ۱۹۱۴ء

علاوہ ازیں قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ وتفسیر از جارج سیل سے بھی استدلال کیا ہے۔ کتب و رسائل کی تفصیل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ مؤرخ نے قادیانی مغالطہ کے ازالے کے لیے بڑی جانفشانی اور تحقیقی وعلمی سرگرمی سے کام لیا ہے اور اس معرکتہ الآراء قادیانی مغالطہ کا تار پود بکھیر کر رکھ دیا ہے مگر اس کے باوجود امتِ مرزائیہ وقتاً فوقتاً اپنے اس غلط مفروضہ کی حمایت میں تحریف و خیانت سے پُر خود ساختہ نظریہ کا سہارا لیکر اس بابت کچھ نہ کچھ لکھ کر امتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کی سعی ناکام کرتے رہتے ہیں۔ اور اپنی تمام تر توانائی صرف کردینے کے باوجود کشمیر میں ابھی تک عیسیٰ علیہ السلام کی قبر کو مستند تاریخی حوالوں سے ثابت نہ کر سکے۔

عارفہ للہ: ناظم صاحب نے اپنا نقطۂ نظر تاریخی دلائل وشواہد سے بھرپور ثابت کیا ہے جسے پڑھ کر ایک محقق کو آپ کا نظریہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ چند دلائل وشواہد آپ بھی ملاحظہ کریں۔ عارفہ للہ صاحبہ کے متعلق کچھ قادیانی صاحبان نے مریم صدیقہ ہونے کا شگوفہ چھوڑا ہے جیسا کہ سابقہ اوراق میں راقم نے تحریر کیا ہے۔ ناظم صاحب موصوف اس قولِ باطل کا ردّ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ کشمیر میں بہت مشہور و معروف مجذوبہ گذری ہیں۔ قریب قریب تمام ہندوستانی اور یوروپین مؤرخین نے تاریخوں میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے متعلق ہندوستانی اور انگریز

مؤرخوں نے بھی علیحدہ کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی بہت سی کرامتیں کشمیر میں مشہور ہیں۔ سن ولادت میں اختلاف ہے ۷۰۰ ہجری و ۷۳۵ ہجری دو سن بیان کیے گئے ہیں۔ صدر المورخین کشمیر ملا عبدالوہاب شائق اپنی تاریخ میں ۷۳۵ ہجری لکھتے ہیں۔ (شائق نے تاریخ کشمیر بحکم راجہ سکھ جیون فرماں زوائے کشمیر ۱۷۵۵ء میں لکھی)۔ للہ کی ولادت کے متعلق ان کا یہ شعر ہے:

"فزون بود بہفت وصدی وپنج زویرانہ شد پہ یارہ گنج

شائق نے ویرانہ اس لیے کہا کہ للہ کے والد برہمن تھے جو دولتِ اسلام سے خالی تھے۔ للہ موضع سم پورہ، علاقہ کشمیر میں پیدا ہوئی۔ یہ زمانہ راجہ ادیان دیو کا تھا یعنی ۱۳۳۴ء۔ ان کا نام للہ ایشوری تھا (ان کو للہ شوری۔ للہ دوی بھی لکھتے ہیں) ہندوؤں کے دستور کے موافق صغر سنی میں شادی ہوگئی۔ موضع پان پور کے ایک برہمن زادے سے نکاح ہوا۔ للہ پر شروع ہی سے محویت اور استغراق کی کیفیت طاری تھی۔ جو ترقی عمر کے ساتھ ترقی کرتی رہی۔ ان کی یہ کیفیت ساس اور شوہر کو بھلی نہ معلوم ہوئی۔ اس لیے ان کو بہت ستایا۔ للہ ایک ہندو فقیر باسدیو کی چیلی (مریدہ) تھی۔ شیو مذھب کے پرستاروں میں تھی۔ (للہ عارفہ بحوالہ یورپین مورخ) آخر جوش جذبہ سے بے اختیار ہوکر کپڑے پھاڑ کر دشت و بیاباں کو نکل گئیں۔ بعض اس کو پاگل سمجھتے تھے بعض مجذوب۔ ایک دن سلطان شہاب الدین (بزمانہ شہزادگی) شکار کو گیا۔ جنگل میں اس مجذوب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے سلطنت و کثرتِ فتوحات کی بشارت دی۔ (اسرار الابرار و تاریخ اعظمی) اس مجذوبہ کی تصنیف کشمیری زبان میں دوہے (اشعار) بھی ہیں۔

۷۷۳ ہجری میں حسب الارشاد حضرت امیر کبیر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ، سید حسین سمنانی کشمیر آئے۔ ان کی آمد کا حال سن کر اس مجذوبہ نے کئی منزل سے استقبال کیا۔ اور ان سے فیض حاصل کیا۔ ۷۸۱ھ حضرت امیر کبیر خود تشریف لائے۔ یہ مجذوبہ اکثر حاضر خدمت رہتی۔ (تذکرۃ العارفین و اسرار الابرار و بہار کشمیر بابت نومبر ۱۹۲۳ء از پنڈت پران ناتھ ایم. ایس. سی، پروفیسر کیمسٹری دیال سنگھ کالج، لاہور و تاریخ شائق و گلدستۂ کشمیر و تاریخ کبیر کشمیر بحوالہ فتوحاتِ کبرویہ مصنفہ ۱۱۸۴ ہجری)۔ .... افسوس سن وفات کسی نے نہیں لکھا۔ انگریز محقق بھی خاموش ہے۔ تاریخ اعظمی میں لکھا ہے (در زمان سلطان شہاب الدین از عالم درگذشت ص ۳۵) سلطان شہاب الدین کا عہدِ حکومت ۷۸۰ھ تک ہے لہٰذا للہ کی وفات ۷۴۳ھ سے ۷۸۰ھ تک کسی سن میں ہوئی۔ مرزا صاحب قادیانی کے مرید ان کو

حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم بتاتے ہیں۔'' ۲۴

اس کے بعد مؤرخ ناظم صاحب نے محمد اسماعیل اور بشیر احمد قادیانی صاحب کی تحریروں سے اقتباس پیش کر کے ان الفاظ میں رد کیا ہے۔ (مذکورہ عبارتیں سابقہ صفحات میں گذر چکی ہیں)۔

''للہ دوی کی تحقیقات تو اوپر گذری۔ یوز آسف کے پاس والی قبر کا تذکرہ آگے آئیگا۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ بلا اختلاف تمام قدیم و جدید تاریخوں میں مذکور ہے کہ وہ قبر سید نصیر الدین خانیاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ اس کے سجادہ نشین وغیرہ باقاعدہ سری نگر میں موجود ہیں اور دونوں قبریں مسلمانوں ہی کے طرز پر ہیں۔

اس کے علاوہ مرزا جی کے ایک تیسرے مرید حضرت مریم کی قبر بیت المقدس میں بتاتے ہیں اور اُسی گرجا میں حضرت مریم صدیقہ کی قبر ہے اور دونوں قبریں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ (اتمام الحجۃ، ص۲۰، ص۲۱) مرزا جی نے خود بھی لکھا ہے حضرت مریم کی قبر زمین شام میں کسی کو معلوم نہیں۔ (حقیقۃ الوحی حاشیہ ص۱۰۱) ان تمام حوالوں سے ثابت ہے کہ نہ للہ دوی مریم صدیقہ ہیں نہ یوز آسف کے گنبد میں مریم صدیقہ کی قبر ہے۔'' ۲۵

اس طرح ناظم صاحب موصوف نے مجذوبہ للہ عارفہ کے متعلق مستند مآخذ سے تفصیلی معلومات رقم فرما کر ان کے مریم صدیقہ ہونے کے خود ساختہ قادیانی مفروضہ کی حقیقت واضح کر دی۔

مرقد عیسیٰ علیہ السلام اور کشمیر: اب آیئے قبر مسیح کشمیر میں ہونے کے خود ساختہ قادیانی مفروضہ کی تردید تاریخی دلائل کی روشنی میں ملاحظہ کریں۔ قادیانی مصنف جے۔ڈی۔ شمس (J.D.Shams) نے جیسا کہ لکھا ہے:

"The tomb next to that of Sayyed Nasr-ur-Din is generally known as that of a prophet who was sent to the inhabitants of Kashmir".

ترجمہ: سید نصیر الدین کے علاوہ دوسرا مقبرہ عام طور پر عوام میں ایک پیغمبر کی قبر سے مشہور ہے۔

مزید لکھتے ہیں:

"The tomb of Jesus Khanyar Street, Srinagar. Kashmir. ۲۶

ترجمہ: مقبرۂ مسیح۔ خانیار اسٹریٹ، سری نگر، کشمیر۔

سید نصیر الدین اور یوز آسف: ناظم صاحب لکھتے ہیں:

''سید نصیر الدین خانیاری ۲۷، جامع کمالات ظاہری و باطنی تھے۔ بیہق کے رہنے والے تھے۔ سلطان زین العابدین کے عہد میں آئے۔ سلطان ان کو اکثر سفارت پر مامور کیا کرتا تھا۔ سری نگر محلہ خانیار میں ان کا مزار ہے۔ یہ مقام روضہ بل بھی کہلاتا ہے۔ ایک گنبد کے نیچے دو قبریں ہیں۔ ایک ان کی، ایک

یوز آسف کی قبر مشہور ہے۔

مرزا قادیانی نے یوز آسف کی قبر کو حضرت عیسیٰ کی قبر بتایا ہے اور ان کے مریدوں نے ان کی (یعنی سید نصیرالدین خانیاری۔ ناقل) قبر کو حضرت مریم صدیقہ والدہ حضرت عیسیٰ کی قبر لکھا ہے۔ جس کو ہم نے للہ مجذوبہ کے بیان میں نقل کیا ہے۔ تمام تاریخوں میں یہ قبر سید نصیرالدین خانیاری کی لکھی ہے۔ یہاں ان کے سجادہ نشین وغیرہ ہیں۔ مرزا جی کے مریدوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ نقل کیا جاچکا ہے۔ اس میں کوئی حوالہ اور قوی دلیل نہیں۔ مریم صدیقہ کے متعلق جو دلائل انھوں نے قائم کیے ہیں اُن کی تردید کے لیے للہ دوی کے حالات کافی ہیں۔ تاریخ سلیمان باغ و تاریخ اعظمی میں مذکور ہے کہ یہاں نبی کی قبر ہے۔ یعنی جس مقام کی یوز آسف نام سے شہرت ہے۔ اس امر کی تصدیق و تکذیب سے ہمارا کوئی نفع نقصان نہیں کہ کشمیر میں کوئی پیغمبر گذرا ہو اور یہ قبر اس کی ہو، اور اس کا نام یوز آسف ہو۔

ہم کو صرف یہ تحقیق کرنا ہے جیسا کہ مرزا جی لکھتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ کی قبر ہے۔ یہ اُنھیں کی قبر ہے یا اور کسی کی ہے؟ مرزا جی نے لکھا ہے کہ شہزادہ نبی کی قبر اور مقام پیغمبر مشہور ہے۔ حضرت والد ماجد فرماتے تھے کہ میرے دریافت کرنے پر کسی نے شہزادہ یا نبی وغیرہ نہیں کہا۔ صرف یوز آسف کہا۔ مقامِ پیغمبر اگر کہا بھی جاتا ہو تو کوئی دلیل نہیں۔

مقامِ پیغمبر کے لقب سے کشمیر میں کئی مقامات مشہور ہیں جو اولیا اللہ کی اقامت گاہ تھے۔ جہاں بزرگانِ دین کو انبیا علیہم السلام کی زیارت ہوئی۔ محلہ راجو بری کدل میں سید حسین بلا دوری کے مزار کے قریب ایک جگہ ''مقامِ نبی'' کے نام سے مشہور ہے۔ موضع بوٹھ کھولہاسہ میں ایک مقام ہے جس کے متعلق خواجہ اعظم اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں ''مکانیست مشہور بقمر موسیٰ پیغمبر۔'' ۲۸

حضرت عیسیٰ اور شہزادگیت: ناظم صاحب نے لفظ ''شہزادہ'' کے پس منظر میں حضرت عیسیٰ مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیاوی زندگی اور طرزِ معاشرت و بود باش پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے قادیانی دلائل کا جائزہ ان الفاظ میں لیا ہے، لکھتے ہیں:

''یہ تاریخ کی کتاب ہے مناظرہ کا رسالہ نہیں جو مَیں حیات و وفاتِ مسیح پر بحث کروں۔ ہاں تاریخی حیثیت سے اس قبر و صاحب قبر کی تحقیق ضروری ہے۔ کیونکہ ''یہ کشمیر کا ایک تاریخی متنازعہ فیہ مسئلہ بن گیا ہے۔'' اس کے متعلق علماء نے بہت سے رسائل و مضامین لکھے ہیں۔ مرزا جی اور اُن کے مریدوں نے بھی بہت زور مارا ہے۔ ہم اصل معاملے کی مکمل تحقیقات ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جو ان شاء اللہ تعالیٰ کسی ایک رسالہ یا کتاب میں بھی نظر سے نہ گذرے گی۔

اگر بقول مرزا جی یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ایک اسرائیلی نبی یہاں آیا تھا اور یہ اس کی قبر ہے اور وہ شہزادہ نبی مشہور تھا۔ تو (بھی یہ) حضرت عیسیٰ کی قبر نہیں ہوسکتی۔ حضرت عیسیٰ کو شہزادہ کہنا تو دن کو رات بتانا

ہے۔ بے باپ غریب ماں کے بطن سے پیدا ہوئے۔ ساری عمر گھر تک بھی نصیب نہ ہوا۔ مرزا جی کے مرید خاص حکیم خدا بخش لکھتے ہیں:

دیلمی و ابن النجار نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام سفر کرتے تھے۔ جب شام پڑ جاتی تو جنگل کا ساگ پات کھالیتے اور چشموں کا پانی پی لیتے اور مٹی کا تکیہ بناتے (یعنی زمین پر ہی بے بستر لیٹ جاتے) پھر کہتے کہ نہ تو میرا گھر ہے کہ جس کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو اور نہ کوئی اولاد ہے کہ جس کے مرنے کا غم ہو۔ (عسل مصطفےٰ حصہ اوّل)

یہ کیسی شہزادگی تھی؟ حضرت عیسیٰ کے شہزادہ مشہور ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔'' ۲۹

شہزادہ نبی: ناظم صاحب شہزادہ نبی کے متعلق لکھتے ہیں:

''اگر یہ اسرائیلی شہزادہ نبی کی قبر ہے تو سلیمان علیہ السلام کی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ حضرت ہی نے کشمیر کو آباد کیا۔ حضرت کے آنے کا ذکر ہندو مؤرخ نے بھی کیا ہے۔ کشمیر میں ایک پہاڑ بھی تختِ سلیمان ۳۰ کے نام سے مشہور ہے۔ اگر نام پہ نظر کی جائے تو حضرت کے وزیر آصف کے بیٹے کی قبر ہوگی۔ پور آصف کا امتدادِ زمانہ سے یوز آصف ہوگیا اور وہ شہزادہ بھی مشہور ہوسکتا تھا۔ یا یوز آصف نام کا کوئی حضرت سلیمان کی نسل کا آدمی ہو وہ فتنہ بخت نصر کے وقت پریشان ہوکر یہاں آیا ہو۔ اُس کا خاندانی تعلق بھی کسی قدر ثابت ہے کہ بہمن شاہ ایران کی بڑی بیگم قبیلہ رحعام بن سلیمان سے تھی اور اس کی دوسری بیگم راجہ سوراندر والیِ کشمیر کی بیٹی تھی۔

اور حضرت موسیٰ کی قبر ہوسکتی ہے کہ حضرت کا کشمیر آنا ہندو مؤرخ نے بھی بیان کیا ہے۔ (گلدستۂ کشمیر ص ۱۷) اور حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت سے وہ شہزادے بھی کہے جاسکتے ہیں۔ اور کشمیر میں دوسری جگہ اُن کا چلّہ بھی موجود ہے۔ سری نگر کے قریب جھیل ہارون بھی ہے جس کو ہارون کہا جاسکتا ہے۔ اور ہندوستان میں کوہِ طور بھی ہے۔ دکن میں ایک پہاڑ کا نام ہے (مثل محکمہ نظامت اسٹیٹ نواب سالار جنگ ۲۸/۱۴۱ ء ۱۳۱۹ھ میں ایک سند شامل ہے۔ اس میں یہ فقرات ہیں: ''بحقایق و معارف آگاہ امیر علی شاہ نوشتہ می شود کہ کاہ طور و چشمۂ بی بی مکان زرخرید مابدولت است، مرقومہ ۱۳۸۳ ہجری)۔

پس کہا جاسکتا ہے کہ دکن کے پہاڑی کوہِ طور پر آکر خدا سے کلام کرتے تھے اور کشمیر میں دونوں بھائی جھیل ہارون کے قریب رہتے تھے۔ جب انتقال ہوگیا تو یہیں دفن ہوگئے۔ موسیٰ اسرائیلی کا بگڑکر امتدادِ زمانہ سے یوز آسف ہوگیا۔ ان رکیک باتوں سے جو عیسیٰ کی قبر بنانے میں کی جاتی ہیں یہ دلیلیں ہزار جگہ مضبوط ہیں۔'' ۳۱

تاریخ سلمان باغ و تاریخ اعظمی: مرزا جی اور دیگر قادیانی صاحبان نے تاریخ اعظمی کی جس ''عبارت'' کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے بہت اُچھالا ہے بلکہ آج تک اُچھال رہے ہیں اس کی تاریخی

حیثیت پر ناظم صاحب کا نقد و جرح ملاحظہ کریں، لکھتے ہیں:

''تاریخ سلمان باغ و تاریخ اعظمی میں ہے کہ یہاں نبی کی قبر مشہور ہے۔ ان دونوں مؤرخین کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ''شہرت'' عام کی نقل کر رہے ہیں۔ مؤرخانہ حیثیت سے اپنی ذمہ داری پر بیان نہیں کرتے۔ اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ ضرور یہاں نبی کی قبر ہے تو بھی حضرت عیسیٰ کی قبر نہیں ثابت ہوسکتی ہے۔ خداوند ذوالجلال نے فرمایا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ہادی بھیجے ہیں۔ ممکن ہے کہ کشمیر میں بھی کوئی نبی ہوا ہو اور اُس کا نام یوز آسف ہی ہو۔ کشمیر کی تاریخوں میں ایک مردِ صالح کا بھی ذکر ہے کہ اُس نے راجہ سندر کے زمانے میں لوگوں کو عذابِ الٰہی سے ڈرایا۔ جب سب نے اس کی تکذیب کی تو سارا شہر خسف کردیا گیا۔ ممکن ہے کہ وہی نبی ہو۔ ہندو مؤرخ جن کی مبالغہ آمیزی مشہور و ثابت ہے راجہ سندر کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح لکھا ہے۔

لیکن اس تاریخ کے مضامین باب دوم میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ راجہ کم و بیشتر پانسو برس قبل مسیح تھا اور یہی زمانہ جیسا کہ آگے بیان ہوگا یوز آسف کا ہے۔ تاریخ اعظمی کا بیان بھی اس معاملہ کو صاف کرتا ہے (حوالہ کی عبارت سابقہ صفحات میں گذر چکی ہے۔ پھر سے ملاحظہ کریں)۔

اس میں اوّل تو ''شہزادہ'' کا لفظ ہے جو کسی طرح حضرت مسیح پر صادق نہیں آسکتا۔ دوسرا لفظ ''مبعوث'' ہے۔ کیونکہ یہ بالاتفاق مسلّم ہے کہ حضرت عیسیٰ کی بعثت کشمیر میں نہیں ہوئی۔ مرزا جی ان کو واقعۂ صلیب کے بعد کشمیر میں لاتے ہیں۔ تاریخ اس نبی کو بیان کرتی ہے جو کشمیر میں مبعوث ہوا۔ کوئی نہیں کہتا کہ رسول کریم ﷺ مدینہ میں مبعوث ہوئے، بدر میں مبعوث ہوئے، تبوک میں مبعوث ہوئے۔ سب یہی کہتے ہیں کہ ''مکہ'' (میں) مبعوث ہوئے۔ مقامِ بعثت وہ ہے جہاں اوّل (اعلان) نبوت (کا اذن) عطا ہو۔ اس لیے کشمیر حضرت عیسیٰ کا مقامِ بعثت نہیں۔ اور تاریخ ''اُس نبی'' کا ''مقامِ بعثت'' کشمیر بتاتی ہے۔ تاریخ سلیمان باغ میں ہے:

ہمدردان روضہ بہشت نشان ۔۔۔ قبر پیغمبریست مشک فشاں
ہر کہ نزدیک او عنان تابد ۔۔۔ بوئے خوش در دماغ خود یابد
نقل کردند راویان کہ بکام ۔۔۔ بود شہزادۂ بفضل تمام
ترک دنیا نمود و سالک شد ۔۔۔ در مقام سلوک مالک شد
بندگی چوں نمود با اخلاص ۔۔۔ شد بہ پیغمبری زیزدان خاص
گشت مبعوث خلق شد ہادی ۔۔۔ عاقبت رفت بست ازیں وادی

ہست آں مشکبوئے تربت او
کہ بہ یوز آسف است شہرت او ۳۴

مصلوبیتِ مسیح حقائق کی روشنی میں: مرزا صاحب اور اُن کے تمام حامیان جملہ اہلِ اسلام کے عقیدہ کے خلاف اپنا نظریہ حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق پیش کرتے ہیں۔ قادیانی صاحبان کا کہنا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہودیوں نے صلیب پہ لٹکا دیا تھا۔ جس کے باعث آپ کا جسم زخموں کی شدت سے متاثر تھا۔ لیکن قرآن کا کہنا ہے کہ صلیب پر ہرگز ہرگز حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نہیں لٹکایا گیا۔ ایک دوسرا شخص جو آپ کا ہم شکل ہوگیا تھا اُسے پھانسی دی گئی۔ ناظم صاحب نے مرزائی عقیدۂ مصلوبیت کے متعلق اپنی تحقیق کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"مرزاجی کا بیان ہے کہ صلیب سے جب جنابِ مسیح اُتارے گئے تو زخمی تھے۔ آپ کا خفیہ طور پر مرہم پٹی ہوا۔ کچھ آرام ہوگیا تو کشمیر چلے آئے۔[۴۳] لیکن مرزا جی کو یہ بھی مسلّم ہے کہ کتب سابقہ مشمول بائبل میں تحریف ہوئی ہے۔ اس لیے ان کا جو بیان موافقِ قران ہو وہ صحیح ہے اور جو قران کے خلاف ہو قابلِ تسلیم نہیں۔

قرآن مجید صاف الفاظ میں واقعۂ صلیب کی تکذیب کرتا ہے۔ (وَمَا قَتَلُوْہُ وَمَا صَلَبُوْہُ یعنی نہ وہ قتل کیے گئے نہ صلیب دیئے گئے)۔ پھر واقعۂ صلیب کیونکر تسلیم کرلیا جائے۔ اس کے علاوہ کتابِ مقدس (بائبل) میں ہے کہ جو کاٹھ پر لٹکایا جائے گا وہ لعنتی ہوگا۔ مرزا جی ایک پیغمبر کو کاٹھ پر لٹکواتے ہیں۔ مسلمانوں کا قدیم اور اجماعی عقیدہ ہے کہ مسیح صلیب نہیں دیئے گئے۔ بلکہ آسمان پر اُٹھائے گئے۔ اُن کا ہم شبیہ صلیب دیا گیا۔ ایسا ہی قرآنی بیان ہے۔ عیسائیوں کے چند قدیمی فرقوں کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ سائیس مسیح کی جگہ صلیب پر لٹکا دیا گیا۔ فرقہ سریفن اور پاکریشن کا عقیدہ ہے کہ مسیح کی جگہ اس کا ہم شبیہ مصلوب ہوا۔ مصنف فوٹیس کہتا ہے کہ میں نے ایک کتاب رسولوں کے سفرنامے پڑھی، جس میں بطرس، یوحنا، اندریاس، طاس پولوس کے اعمال مندرج تھے۔ اس میں مذکور ہے کہ مسیح مصلوب نہیں ہوئے بلکہ ان کی جگہ اور شخص مصلوب ہوا۔ (حاشیہ سورۂ آلِ عمران۔ انگریزی ترجمہ ڈاکٹر جارج سیل) مروجہ بائبل سے اگر اس واقعہ کو دیکھا جائے تو اس میں اس قدر شدید اختلاف ہے کہ کوئی صاحبِ ہوش اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔"[۴۴]

مزید اس موضوع پر گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے مؤرخ نے اناجیل کے تضاد اور آپسی اختلاف کو تفصیل سے واضح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اس اختلاف کو دیکھتے ہوئے کون ہوش مند واقعۂ صلیب کو قبول کرسکتا ہے۔ یہود نے تو مسیح کا مصلوب ہونا اس لیے بیان کیا کہ وہ اُن کو سچا رسول نہ سمجھتے تھے۔ اس لیے اُن کو توریت کے اس حکم کا مصداق بناتے ہیں کہ جو کاٹھ پر لٹکایا جائے گا وہ لعنتی ہوگا۔ اس کے

علاوہ ایک شخص کو انہوں نے صلیب دی بھی جو ان کی نظروں میں "مسیح" ہی تھا۔
نصاریٰ نے اُن کے بیان اور عقیدہ سے زچ ہوکر "یہود" کو "ظالم وشقی" ٹھہرانے کے لیے مسیح کے مظلوم ومصلوب ہونے کو ایک فضیلت قرار دیکر "کفارہ" کا مسئلہ گھڑلیا۔ یہی عقاید اس نشانِ قبر کا باعث ہیں جو بیت المقدس میں بتائی جاتی ہے۔ اس کو مرزا جی اور اُن کے مرید بھی صحیح قبر نہیں سمجھتے۔

غرض حسب بیان مرزا جی مسیح کا کشمیر آکر وفات پانا واقعۂ صلیب پر منحصر ہے۔ جب واقعۂ صلیب ہی ثابت نہیں تو قبر کیسی؟ قبر کے متعلق مرزا جی اور اُن کے مریدین کے بیانات بھی اس قدر مختلف ہیں کہ ان پر بھروسہ نہیں ہوسکتا۔ کبھی بیت المقدس بتاتے ہیں جس کا فیصلہ اوپر ہوچکا، کبھی مدینہ شریف کے پہاڑ عتیف پر بتاتے ہیں۔ چنانچہ کتاب چشمۂ معرفت کے حاشیہ پر لکھتے ہیں: "اور ایک کتاب تاریخ طبری کے ص ۷۳۹ میں ایک بزرگ کی روایت ہے، حضرت عیسیٰ کی قبر کا بھی حوالہ دیا ہے جو ایک جگہ دیکھی گئی یعنی قبر پر پتھر پایا جس پر یہ ...... لکھا ہوا تھا کہ یہ رسول اللہ عیسیٰ ابن مریم کی قبر ہے۔ یہ قصہ ابن جریر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے جو نہایت معتبر اور ائمۂ حدیث میں سے ہیں۔)

اس روایت کو بڑے شد ومد سے مرزا جی کے مریدوں نے اخبارات الحکم ۱۹۰۷ء، البدر ۱۹۰۷ء، فاروق ۱۹۳۶ء، رسالہ تشحیذ الاذہان ۱۹۱۳ء، کتاب محقق ص ۱۱۸، کتاب نعم الوکیل ص ۴۰، کتاب مرآۃ الحقائق جلد سوم میں پیش کیا ہے۔ ۳۵

اس روایت پر محدثین نے کلام کیا ہے۔ اس کے ایک راوی پر جرح وتاویل ملاحظہ کریں۔ ناظم صاحب لکھتے ہیں:

"اس روایت میں ایک راوی محمد بن اسحاق ہے جس کو امام مالک نے دجّال کہا ہے۔ امام احمد بن حنبل نے کہا ہے بیاضی فرقہ کا آدمی ہے۔ امام ابو داؤد نے قدری فرقہ سے بتایا ہے۔ ہشام بن عروہ وشیخ یحییٰ بن قطان محدثین نے کذاب کہا ہے۔ (میزان الاعتدال، جلد سوم)۔ پھر یہ روایت کیونکر معتبر اور قابل سند ہوسکتی ہے۔ اس راوی کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سرور شاہ مرزا جی کے مرید خاص نے اپنی کتاب "القول المحمود فی شان الموعود" میں تسلیم کیا ہے۔ اور مرزا جی کے دوسرے خاص صحابی حکیم خدا بخش نے لکھا ہے یہ قبر فرضی ہے اور بلا شک فرضی ہے۔" (عسل مصفےٰ، جلد اوّل، ص ۴۱۸)

طبری میں اس روایت میں اس پتھر پر یہ لکھا ہوا بتایا گیا ہے "رسول اللہ عیسیٰ بن مریم کی قبر ہے" لیکن دیگر کتب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس میں سہو کاتب سے ایک "رسول" رہ گیا۔ ایک قدیم ومعتبر کتاب 'وفاء الوفا' میں ہے کہ اس پتھر پر لکھا تھا "رسول رسول اللہ عیسیٰ

ابن مریم" طبری کے کاتب سے ایک رسول چھوٹ گیا ہے۔ اور اب تو مرزا جی یا کوئی ان کا مرید بھی اس قبر کا ذکر نہیں کرتا۔ چلو اس کا بھی فیصلہ ہوا۔ اب رہی یوز آسف کی قبر اس کے متعلق بھی مرزا جی اور ان کے مریدین کے بیانات مضطرب ہیں۔ ان کو خود اطمینان نہیں کہ یہ قبر مسیح کی ہے۔ ازالہ الاوھام میں لکھتے ہیں: مسیح اپنے وطن گلیل میں جا کر فوت ہوا۔"

(تقطیع کلاں، ص ۴۷۳) ۳۶

یوز آسف: شخصیت اور حقائق: مرزا صاحب اور دیگر قادیانی صاحبان "یوز آسف" کو ہی حضرت عیسیٰ کی شخصیت منوانے پہ تلے ہوئے ہیں۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یوز آسف کی شخصیت پر بھی مؤرخانہ انداز سے ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ قادیانی مغالطہ کا پس منظر بالکل ہی واضح ہو جائے اور کشمیر کے متعلق اس تاریخی تنازعہ کا فیصلہ ہو جائے۔ قاضی ظہور الحسن ناظم لکھتے ہیں:

"مرزا جی نے اپنی دو درجن سے زاید کتابوں میں بحوالہ کتاب اکمال الدین لکھا ہے کہ شہزادہ یوز آسف ہی حضرت عیسیٰ تھا۔ اور مرزا جی کی تقلید میں ان کے بہت سے مریدوں نے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ لیکن حوالہ سراسر غلط ہے۔ کتاب اکمال الدین اور واتمام النعمۃ فی اثبات الغیبۃ کشف الحیرہ شیخ سعید ابی جعفر محمد بن علی بن الحسین موسیٰ بن بابویہ القمی کی ہے۔ ایران میں ۱۳۰۱ھ میں طبع ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۸۹۶ء میں مفید عام پریس، آگرہ میں چھپا جس کا حوالہ مرزا جی نے اپنی کتاب رازِ حقیقت میں دیا ہے۔ اس کا نام شہزادہ یوز آسف اور حکیم بلوہر ہے۔ اور ایک ترجمہ تنبیہ الغافلین نام سے مطبع صبح صادق میں شائع ہوا۔ ایک دوسری کتاب یوز آسف و بلوہر مطبع شمسی دھلی میں طبع ہوئی۔ کتاب اکمال میں یوز آسف کا حال اس طرح لکھا ہے:

"ہندوستان کے بادشاہوں میں (ملکاً من ملوك الهند) ایک بڑا بادشاہ تھا۔ بت پرست، عیاش، ظالم۔ اس کا نام جیبر تھا۔ اس کے ایک خوبصورت لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام یوز آسف رکھا گیا۔ نجومیوں نے اس لڑکے کا طالع دیکھا اور بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ یہ شہزادہ بڑا صاحب مرتبہ ہوگا۔ لیکن ایک نجومی نے کہا کہ اس کے نصیب میں جو بڑائی ہے وہ آخرت کی ہے۔ بادشاہ یہ سُن کر غمگین ہوا اور شہزادہ کو علیحدہ ایک مکان میں رہنے کا حکم دیا۔ اور اس کے پاس لوگوں کو آنے جانے سے منع کر دیا اور تاکید کر دی کہ کوئی آخرت کا ذکر نہ کرے۔ ایک عابد حکیم بلوہر نام (کا) لنکا سے تاجرانہ لباس میں آ کر شہزادہ سے ملا اور اس کو تعلیم و تلقین کرنے لگا۔ بادشاہ کو خبر ہوئی۔ بلوہر بھاگ گیا۔ بادشاہ نے چار ہزار عورتیں شہزادے کے پاس بھیج دیں تاکہ اُن سے مانوس ہو کر دنیا کی طرف راغب ہو۔ مگر شہزادے نے کسی کی طرف التفات نہ کیا۔ آخر ایک راجہ کی بیٹی بھیجی گئی۔ شہزادہ اُس پر "فریفتہ" ہو گیا اور "ملوث" ہوا۔ اس لڑکی کو حمل ہو گیا۔ ۹ مہینے بعد اس کا لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا نام "ساملی" رکھا گیا۔ اس کے بعد یوز آسف نے توبہ کی۔ اس کے

پاس خدا کا فرشتہ آیا۔

اب یوز آسف لوگوں کو ہدایت کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ بہت لوگ اس پر ایمان لائے۔ پھر اس کا باپ بھی اس پر ایمان لایا۔ یوز آسف کے باپ کے مرنے کے بعد اس کی غیبت میں یوز آسف کا چچا سمتا نام یوز آسف کی طرف سے حکمرانی کرتا تھا۔ بعد بلوغ اس کا لڑکا حکمران ہوا۔ اور یہ سلطنت نسلاً بعد نسلٍ مدّت تک اُس کے خاندان میں رہی۔ آخر کشمیر میں آ کر فوت ہوا۔ اپنے مرید ''ابابیل'' (بعض نے یابد لکھا ہے) کو جانشین کرگیا۔ یہ واقعات ہم نے کتاب یوز آسف وبلوہر سے منتخب کر کے لکھے ہیں۔ ۳۷ے

صاحب تاریخ کبیر کشمیر (حصہ تحائف الابرار) کی وضاحت:

''در کتاب سوانح عمری کہ بزبان عربی است مرقوم است کہ یوز آسف مذکور راجہ بود ساکن مقام شولایت از وطن مالوف خود سیر کنان در کشمیر رسیدہ بعد توقف در آں جا انتقال نمود در محلّہ انیرہ مرہ کہ از محلّہ خانیار واز مقام روضہ بل محلّہ جداگانہ بجانب غرب واقع است۔'' ۳۸ے

کچھ لوگوں نے یوز آسف کو بدھ تسلیم کیا ہے۔ جیسا کہ ''ابن ندیم'' کے ص ۳۴۷ اور ''بدھسٹ برتھ اسٹوریز'' کے ص ۳۶ (دیباچہ) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ ''الفرست'' کے مطابق یہ نام کئی مختلف صورتوں میں لکھا جاتا ہے مثلاً ''بواسف''، ''یواسف''، ''برسف''، ''بود آسف''، ''بور آسف'' بود اسف''، ''سور آشف''، ''یوز آصف'' وغیرہ وغیرہ۔ ایس ڈیوڈز نے ''بدھ'' کو ''جوز آفٹ'' لکھا اور ''جوز آفٹ'' ہی کو عربی میں ''یوز آسف'' لکھا جاتا ہے۔ اور یوں ہی قدیم فارسی میں دال کی جگہ ذال لکھتے ہیں۔ اس لیے ''یوذ'' کا یوز ہوا۔'' ۳۹ے

بقول ایک یورپین اسکالر کے:

''بودی ستو'' کا یوز آسف ہوگیا اور ''بلوہر'' کی اصل ''پروہتر'' بمعنے گُرو ہے۔ بُودھ کو ایرانی بودھ آسف ہی کہتے ہیں۔ چنانچہ ایران کے ''نو وہار'' (عام طور پر ''نوبہار'' لکھتے ہیں اصل ''وہار'' ہے۔ بُدھ مذہب کے معبد کو ''وہار VIHAR'' کہتے ہیں) کے دروازہ پر کندہ تھا ''یوز آسف کا قول ہے کہ بادشاہوں کے دروازے تین خصلتوں کے محتاج ہیں 'عقل' اور 'صبر' اور 'مال'۔ (مسعودی) جاتکاہ (کتاب پیدائش) میں شاہزادہ کپلا وستو اور اس کے مریدوں کو بودھست (طالب حق) کے لفظ سے مخاطب کیا کرتے تھے۔'' ۴۰ے

<u>کتاب یوز آسف کی اسنادی حیثیت:</u> مؤرخ ناظم صاحب لکھتے ہیں:

''یوز آسف کی کتاب کی حقیقت یہ ہے کہ ایک کتاب (جو یوز آسف کے نام سے مشہور ہے) کا ترجمہ خلیفہ منصور عباسی کے زمانے میں سنسکرت سے عربی میں عبداللہ بن مقفع نے کیا۔ اس کا نام ان کتابوں میں درج ہے جس کا ترجمہ سنسکرت سے عربی میں ہوا ہے (فہرست ابن الندیم) کتاب النۃ مشرقیہ کے

ص ۸۸ پر جو کتب مترجمہ کی فہرست ہے اس میں بھی اس کتاب کا سنسکرت سے ترجمہ ہونا لکھا ہے:

خلیفہ منصور عباسی کے عیسائی طبیب یوحنا نے اس کا ترجمہ یونانی زبان میں کیا۔ عربی، فارسی، جارجین، ارمنی، عبرانی، نکالا، بوہمیا، پولنڈ اور آئس لینڈ کی زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ ۱۲۰۴ء ناروے کے ایک بادشاہ نے خود اس کا ترجمہ کیا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ یہ کتاب حکیم یوحنا کی تصنیف ہے۔

سائموں میٹا فراسٹ نے اپنی کتاب ''تذکرۃ الاولیاء'' میں ۱۱۵۰ء میں اس کتاب کو شامل کیا اور یوز آسف کو مسیحی اولیاء میں شامل کیا۔ تیرہویں صدی عیسویں میں ونسنٹ نے اس قصہ کو اپنی کتاب ''اسپیکولم ہسٹوریال'' میں داخل کیا۔ اور جیکولس ڈی ڈورمن نے اس کا اختصار کر کے اپنی کتاب ''گولڈن لیجنڈ'' میں شامل کیا۔ ان نقول وتراجم کا یہ اثر ہوا کہ یوز آسف ویلویر سینٹ جوز آفٹ وسینٹ بالم کے لقب سے کلیسا یونانی، رومی کے اولیاء میں شامل ہو گئے۔ مجتہدین شیعہ نے اس کو حضرت امام زین العابدین کی طرف منسوب کر کے چوتھی صدی ہجری میں حدیث میں داخل کر لیا۔ اور علامہ ابو جعفر محمد بن علی ابن بابویہ القمی نے اس کا نام اکمال الدین اتمام النعمہ رکھا۔ اخوان الصفا جو چوتھی صدی کی تصنیف ہے اس میں اس کتاب کے بہت سے ابواب شامل ہیں۔ اب مرزا جی نے اس کو حضرت مسیح کی انجیل کہنا شروع کر دیا۔'' [۴۱]

یوز آسف اور بدھ: کیا حقیقتاً یوز آسف اور بدھ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں یا واقعی دو مختلف الوجود شخصیات ہیں۔ چونکہ اس معاملے میں بھی کچھ صاحبان عام لوگوں کے علاوہ اچھے خاصے اہلِ علم حضرات کی آنکھوں میں دھول جھونک کر دھوکہ دینے کی اپنی سی سعی کرتے رہتے ہیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ تاریخی اعتبار سے یہ دو الگ الگ شخصیات ہیں، جیسا کہ مؤرخ ناظم صاحب لکھتے ہیں:

''یوز آسف جیسا کہ بعض کا خیال ہے کہ گوتم بدھ تھے صحیح نہیں کیونکہ اس کا زمانہ بدھ سے تین سو برس بعد لکھا ہے (کتاب یوز آسف ویلویر کے مطابق۔ پھون جب یوز آسف پر ایمان لایا اس وقت بدھ کو تین سو برس گذر چکے تھے) چونکہ یہ بدھ سے تین سو برس بعد ہے اس لیے مسیح سے کم وبیش ۲۵۰ سال قبل ہے۔ کیونکہ بدھ کے زمانہ کا تخمینہ بعض مؤرخین نے زیادہ سے زیادہ ۵۵۰ سال قبل مسیح لکھا ہے۔ اس لیے یوز آسف نہ بدھ ہے نہ مسیح، یہ تیسرا شخص ہے۔'' [۴۲]

ملاحظہ کریں گوتم بدھ اور حضرت مسیح کے درمیان مؤرخین کے نزدیک ۵۵۰ سال کا عرصہ گذرا ہے۔ اور مؤرخین کے نزدیک گوتم بدھ اور یوز آسف کے درمیان ۳۰۰ سال کا زمانی فاصلہ ہے اس لیے یوز آسف گوتم بدھ نہیں بلکہ ان کے بعد ہونے والی کسی اور شخصیت کا نام ہے۔

حضرت مسیح اور یوز آسف: مذکورہ بالا حوالے کی عبارت سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ یوز آسف نہ تو بدھ ہیں اور نہ مسیح بلکہ اُن کی شخصیت ان دونوں صاحبان سے بالکل جُدا ہے۔ ہم نے اس فرق کو زمانی

اعتبار سے دیکھا ہے۔ اب حضرت مسیح اور یوز آسف میں صفاتی اعتبار سے فرق ملاحظہ کریں۔ بقول مورخ:

''اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ کشمیر میں کوئی نبی مبعوث ہوا تو وہ بھی وہ نبی یوز آسف نہیں ہوسکتا کیونکہ یوز آسف کا ''زنا'' کرنا ثابت ہے۔ (حوالہ سابقہ صفحات میں گذر چکا ہے) انبیاء علیہم السلام معصوم تھے۔ اُن سے یہ حرکت نہ قبل (اعلانِ) نبوت ممکن تھی نہ بعد (اعلانِ) نبوت۔ ہاں یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ بعد کو چونکہ وہ تائب ہوگیا اس لیے اولیاء اللہ میں سے ہوا ہو۔ اگر یوز آسف ''نبی'' تھا تب بھی مسیح نہیں ہوسکتا۔ مسیح بے باپ غریب ماں کے بطن سے پیدا ہوئے، نکاح نہیں کیا۔ پھر اولاد کیسی اور نسل وحکمرانی کا کیا ذکر۔ ساری عمر بے سروسامان رہے۔ یوز آسف نے بادشاہ کے گھر میں آنکھ کھولی۔ اولاد پیدا ہوئی۔ اس کی (کئی) نسلیں حکمران رہیں۔ کوئی ایک بات بھی مسیح سے نہیں ملتی۔'' ۴۳

یوز آسف مختلف کتب تواریخ کی روشنی میں: یوز آسف کی ''شخصیت'' اور ''حقائق'' کے متعلق ہم نے مختلف فنِ تاریخ سے وابستہ اہلِ علم کی رائے ملاحظہ کی لیکن یوز آسف کے متعلق تصویر کے سارے رُخ بالکل واضح رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل اقتباسات کا مطالعہ بھی بہت ضروری ہے، تا کہ بحث کی ساری جہتیں نظروں کے سامنے ہو اور قارئین بحث کے کسی حتمی نتیجہ پر پہنچ سکیں۔ ناظم صاحب کا کہنا ہے کہ:

''یوز آسف ایک شخص تھا مصر کا رہنے والا جو سلطان زین العابدین (جنھیں کشمیری عوام بڈ شاہ کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ناقل) کے زمانے میں سفیر ہو کر آیا تھا۔ سید نصیرالدین خانیاری سے اس کا بہت ارتباط تھا۔ وہ یہیں مرا۔ وہ اور سید نصیرالدین خانیاری ایک ہی جگہ مدفون ہیں۔ اور یہ مزار دونوں بزرگوں کے نام سے مشہور ہے اس کی عینی شہادت موجود ہے۔'' ۴۴

صاحب تاریخ اسرار الاخیار رقم فرماتے ہیں:

''لمّا صاحب وقائع ملک کشمیر کہ در عہد سلطان زین العابدین بود روایت می کند کہ سلطان از جانب سید عبداللہ بیہقی را با تحائف و نفائس فراوان بطور سفارت نزد خدیو مصر فرستاد، استحکام رابطۂ محبت و اخلاص را سلسلۂ جنبانی نمود پس خدیو مصر از جانب خود یوز آسف نام شخصے را کہ از احفاد حضرت موسیٰ پیغمبر بود بکمالات صوری و معنوی خرید دیر و یگانہ مصر بود نزد سلطان زین العابدین بطریق رسالت مامور ساخت چوں سفیر مذکور وارد خطۂ دلپذیر گشت با سلطان رابطۂ اخلاص درست کرد و مراسم رسالت بجا آوردہ واپس رجعت نمود بعد چند گاہ بمرافقت سید نصیرالدین بیہقی کہ از احفاد سید علاؤالدین بیہقی است۔ از طرف سلطان در نزد شریفِ مکہ بطور رسالت و کالت رفتہ بود باز آمدہ۔ پس یوز آسف بموانست و مجانست سید نصیرالدین بیہقی عمر خود در ینجا بسر کرد۔'' ۴۵

صاحبِ تاریخ حسن "زینشتی شور" ۴۶؎ کے عنوان سے ایک بت خانہ جس کی مرمت ۱۴۶۹ء میں بحکمِ سلطان زین العابدین کے ہوئی اس کی روداد بیان کرتے لکھتے ہیں:

"دریں وقت یوز اسپ نام جوانے از مصر آمدہ دعوائی پیغمبر زادگی می کند۔" ۴۷؎

مزید لکھتے ہیں:

"وآنکہ دریں کتاب مذکور است کہ شخصے "یوز آسپ" نام از مصر آمدہ دعوئی پیغمبری می کرد۔ کلیۂ محقق نکشتہ است۔ بقول ڈاکٹر صوفی (کشمیر جلد اوّل ص ۴۰) یوز آسف مزبور بہ حیثیت سفیر در زمان بڈ شاہ (سلطان زین العابدین) در کشمیر وارد گش۔ قرین قیاس ایں است کہ "یوز آسپ" دراصل "یوذ اسف" (بودھی ستو) است۔ تاریخ شاہد است کہ کشمیر تا ظہورِ اسلام مانندِ بلخ و بخارا و افغانستان و ترکستان یکے از مراکزِ دین بودہ بہ شمار میرفت و بسیارے از وہار ہائے (معبد ہائے) ایں دریں سرزمین بودند مشابہت اگی مابین ایں ہر دو چیزے دیگر مؤید ایں خیال است۔ روایتِ عام کہ بوذ اسف دراصل حضرت مسیح علیہ السلام بودند ظاہراً ضعیف است۔" ۴۸؎

__خلاصۂ مباحث:__ مذکورہ بالا عبارتیں اور سابقہ حوالہ جاتی اقتباسات کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ "یوذ آسف" "یک نہ شد دو شد" یعنی کشمیری مؤرخین کے نزدیک کشمیر میں بوذ آسف کے نام سے دو شخصیتیں ہوئی ہیں۔ اوّلِ ذکر کا زمانہ "بُدھ" کے تین ۳۰۰ سو برس بعد اور حضرت مسیح سے لگ بھگ ڈھائی ۲۵۰ سو سال قبل ہے۔ مؤخرِ ذکر کا زمانہ سلطان زین العابدین کا دورِ حکومت ہے۔ مؤرخین کے نزدیک سلطان زین العابدین کا زمانہ ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء تک ہے۔ ۴۹؎

اوّلِ ذکر سے مؤرخین کے نزدیک "زنا" کا صدور ہوا ہے۔ ان کی شادی ہوئی ہے۔ اُن کے بال بچے ہوئے ہیں جنھوں نے کشمیر پر حکومت کی ہے۔ جبکہ مؤخرِ ذکر کا وجود حضرت مسیح سے لگ بھگ ۱۴۲۰ سال بعد کا ہے جو سید نصیر الدین خانیاری کا مقرب ہے۔ اور الحمدللہ حضرت نصیر الدین خانیاری اہلِ کشمیر مؤرخین کے نزدیک زمرۂ اولیا میں شامل اُمتِ محمدیہ کے ایک عظیم فرد ہیں۔ لہٰذا حقائقِ بالا کی روشنی میں ان دونوں یوذ آسف حضرات سے حضرت مسیح کی کوئی مماثلت نہیں۔ نہ باعتبارِ زمانی اور نہ باعتبارِ ذاتی و صفاتی۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو بھی حضرت مسیح نہیں مانا جاسکتا۔ اور جب یہ حضرات مسیح نہیں ہیں تو پھر ان کے "مرقدوں" کو "مسیح کی قبر" کہنا یا بطور پروپیگنڈہ کے بتانا فنِ تاریخ کا منہ چڑھانا ہی نہیں بلکہ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ علاوہ ازیں "دعوائے پیغمبر زادگی اور دعوائے پیغمبری" میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جس طرح آج سادات کرام کا سلسلہ پایا جاتا ہے عین ممکن ہے دیگر انبیا کرام کی اولاد کا سلسلہ بھی پایا جائے۔ مصر اور اطرافِ مصر تو انبیا کرام کے نزول کا خاص مرکز رہا ہے۔ لہٰذا اگر ان اطراف کے

باشندگان میں سے کوئی قبیلہ اپنے کو پیغمبر زادہ ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ غالباً کذب و افترا اور غلط بیانی پر محمول نہ ہوگا۔ مَیں سمجھتا ہوں مصر سے آنے والے ''یوز آسف'' نے اپنے آپ کو ''پیغمبر زادہ'' ہونے کا دعویٰ کیا تھا جسے اپنے مفاد کے پیشِ نظر مرزا صاحب اور دیگر اُن کے ہم خیال قادیانی صاحبان نے ''دعوائے پیغمبری'' میں تبدیل کر دیا۔ کیونکہ کذب بیانی، تحریف و الحاق اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا اس جماعت کا بھی خاص وطیرہ ہے۔

مرزا صاحب نے اپنی کتاب ''مسیح ہندوستان میں'' میں حضرت مسیح (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ہندوستان آنا ثابت کیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یروشلم سے سری نگر کا ''نقشۂ سفر'' بھی مرتب فرمایا ہے۔ مرزا صاحب نے اس طویل سفر کا مقصد حضرت مسیح کو ''اپنی کھوئی ہوئی بھیڑوں'' کی ''تلاش'' بتایا ہے۔ مرزا صاحب کے نزدیک کشمیر اور افغانستان کے اطراف میں آباد تو میں اسرائیلی ہیں جو دراصل مسیح کی کھوئی ہوئی ''بھیڑیں'' ہیں۔ افغانی اور کشمیری اسرائیلی ہیں یا نہیں؟ مجھے اس مسئلہ پر فی الحال گفتگو نہیں کرنی ہے۔ خواہ مخواہ ایک نئی بحث چھیڑ کر مَیں اپنے مقالے کو طویل نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن مرزا صاحب کی یہ ''دلیل'' بھی چند حقائق کی روشنی میں قابلِ توجہ ہے۔

۱۔ اگر حضرت مسیح اپنی کھوئی ہوئی ''بھیڑوں'' (جو دراصل بنی اسرائیل کے لیے بطور استعارہ کے استعمال ہوا ہے) کی تلاش میں کشمیر آئے تو حضرت مسیح کو قوم نے قبول کیا یا عدم التفات کا مظاہرہ کیا؟

۲۔ آپ کو اگر قوم نے دل و جان سے قبول کیا تو افغانیوں اور کشمیریوں نے آپ کی ذات کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیمات کو بھی قبول کیا ہوگا یا نہیں؟

۳۔ اگر قوم نے مذہب عیسائیت کو قبول کرلیا تھا تو پھر افغانستان و کشمیر کی تاریخ اس خطے میں ''دینِ عیسوی'' کی نشر و اشاعت اور اس کے اثرات پر اب تک خاموش کیوں ہے؟

۴۔ کیا افغانستان و کشمیر کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ نے اپنی تلاش و جستجو اور تحقیق و کھدائی میں اب تک کسی ایسے ٹھوس ثبوت کے حصول کا دعویٰ کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہو کہ اس خطے کی تہذیب و تمدن پر کلیسائی اثر و رسوخ کے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں؟ کیا ان خطوں میں زمانۂ مسیح کے عیسائی معبدوں کا نشان یا سراغ ملتا ہے؟

۵۔ کشمیر میں دینِ عیسائیت کے قبول کرنے والوں میں سے کون کون سے افراد بعد از ''انتقالِ مسیح فرمانروائے سلطنت گذرے ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے عہد میں دینِ عیسوی کے اثرات کو محفوظ رکھنے کے لیے کون کون سے اقدام کیے؟ نیز ''دینِ عیسوی'' کے حامل افراد نے کتنے سالوں تک کشمیر پر حکومت کی؟

۶۔ اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ حضرت مسیح کو اُن کی قوم نے قبول نہیں کیا تو بعد از ''وفات'' مرزائی عقیدے کے مطابق حضرت کی قبر کس نے بنوایا؟ اس کے تواریخی شواہد کیا ہیں؟

۷۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیر کے قدیم باشندے ہندو عقیدے کے حامل تھے اور ہندو اپنے مُردوں کو جلا دیتے ہیں لہٰذا عدم قبول کی صورت میں (مرزائی عقیدے کے مطابق بعد از وفاتِ مسیح) ہندو ایک اجنبی کی لاش سمجھ کر جلا دیتے نہ کہ باقاعدہ اسلامی طرز پر دفن کر کے مرقد پر مقبرہ بنواتے؟

۸۔ جس قبر کو مرزائی صاحبان ''مسیح کی قبر'' قرار دیتے ہیں اس پر مذہب عیسوی کا کونسا شعار ہے جس سے اس قبر کی تخصیص ہو کہ یہ قبرِ مسیح ہے؟

۹۔ بفرضِ محال اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ حضرت مسیح کی قبر ہے تو پھر اس کے ساتھ دوسری قبر جو حضرت سید نصیرالدین بیہقی خانیاری رحمۃ اللہ علیہ کی ہے وہ وہاں پر کیسے دفن ہیں؟

۱۰۔ ان دونوں میں سے پہلے کون مدفون ہوا؟ اس کی مستند دلیل و شواہد کیا ہیں؟

۱۱۔ حضرت سید نصیرالدین خانیاری رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد و سجادہ نشین حضرات اس مقبرہ پہ قابض کیوں ہیں؟ اس کا منتظم و متولی تو کسی عیسائی کو ہونا چاہیے۔ اب تک پاپائے روم، اسقف اعظم نے اس عمل دخل کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کیوں نہیں کیا؟ یا مقامی عیسائیوں کی تنظیم نے اس پر دعویٰ کیوں نہیں کیا؟

۱۲۔ مرزا صاحب کی اس ''نئی دریافت'' پر ان کی مہربان انگریزی گورنمنٹ تاج برطانیہ کے کار پردازوں نے بھارت پر اپنے دورِ حکومت کے زمانے میں اس مقبرے پر اپنا قبضہ کیوں نہیں کیا اور اسے کسی عیسائی ادارے کی تحویل میں کیوں نہیں دیا؟

۱۳۔ کشمیر کی سب بنیادی اور قدیمی تاریخی ماخذ سنسکرت میں پنڈت کلہن کی تصنیف ''راج ترنگینی'' ہے۔ جس کا فارسی ترجمہ ملّا شاہ محمد شاہ آبادی نے تاریخ کشمیر کے نام سے کیا ہے۔ جس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ذکر ان الفاظ میں:

> ''زشیشرار Jyesthesrar۔ ایں بتکدہ برقلۂ کوہی ساختہ شدہ کہ بہ نام تختِ سلیمان شہرت دارد۔ اسم ایں کوہ گو پادری نیز است۔ مسلمانان را عقیدہ برآنست کہ حضرت سلیمان پیغمبر بن داؤد (۱۰۲۳۔۹۷۵۔ق م) بہ وسیلہ تخت رواں در کشمیر آمد و چندی برقلہ کوہ مذکور آرمید بریں سبب آنرا تخت سلیمان گفتہ اند حسن زیشتی شور نوشتہ است''۔ ۵۰

لیکن اس کے برعکس حضرت مسیح کی آمد کا ذکر اس میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ مذکورہ بالا سوالوں کے پس منظر میں قادیانی نظریات کو تسلیم کر لینا محققین کے لیے دشوار اور مشکل پہلو ہے۔ اس کے علاوہ کشمیر سے متعلق مختلف مؤرخین نے بہت سارے عجیب و غریب واقعات کو نقل کیا ہے۔ ''فدا حسین ایک کشمیری مؤرخ کی تحقیق کے مطابق فرعونی مظالم کے پیش نظر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہندوستان آ گئے تھے اور کشمیر سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور مقام بانڈی پورہ کی پہاڑی ''معاب'' پر رہائش اختیار کی اور یہیں پر حضرت موسیٰ علیہ السلام والصلوٰۃ کا وصال ہوا۔ اور اسی پہاڑی پہ ان کی قبر ہے۔ یوں ہی ''روزنامہ پرتاپ'' دہلی (۲۵؍

نومبر ۱۹۸۱ء، ص۲) کے مطابق مؤرخ محمد اعظم نے بھی اس قسم کا انکشاف کیا تھا۔ ۵۱

لیکن ہفتہ روزہ ''کشمیر'' راولپنڈی (۱۰ تا ۱۶ جولائی ۱۹۸۴ء ص۱۱) کی رپورٹ کے مطابق ''مغربی جرمنی کی ایک تحقیقاتی ٹیم کے مطابق مرزا صاحب کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہے کہ ''یوذاسف'' کے نام سے جو قبر مشہور ہے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آرام گاہ ہے۔ تاہم ٹیم نے اندازہ لگایا ہے کہ حضرت عیسیٰ وادیِ کشمیر میں کچھ عرصہ رہے ہوں گے۔ ۵۲

فکرِ قادیانیت کا باہمی تضاد: قبرِ مسیح کے متعلق خود مرزا صاحب اور دیگر مرزائی حضرات کسی ایک نظریے پر متفق نہیں ہیں۔ بلکہ ان تمام صاحبان کی دلیلیں باہم ایک دوسرے سے متضاد و متناقض ہیں۔ مرزا جی کے مرید حکیم غلام رسول اپنی کتاب ''التنقید'' میں رقم فرماتے ہیں:

''ممکن ہے کہ یوزآسف کے نام کا شہزادہ بھی ہو چکا ہو جس کا نام مسیح کے اسی نام پر رکھا گیا ہو۔'' ۵۳

مرزا جی کے ایک دوسرے مرید و اُمتی صادق حسین صاحب اپنی کتاب ''کشف الاسرار'' (مطبوعہ ۱۹۱۱ء مطبع بدر قادیان) میں لکھتے ہیں:

''پھون جب ایمان لایا تو اُس وقت تین سو برس بُدھ کو گزر چکے تھے۔ یوزآسف کے زمانہ کے دو سو برس بعد یہ کتاب لکھی گئی۔ اور چونکہ بُدھ حضرت عیسیٰ سے قریباً پانسو برس پہلے گذرا ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب غالباً حضرت کے زمانے سے کچھ پہلے لکھی گئی تھی۔'' ۵۴

ملاحظہ کریں حکیم غلام رسول قادیانی کے مطابق ''یوزآسف کا زمانہ حضرت مسیح کے بعد کا ہے مگر صادق حسین قادیانی کے مطابق یوزآسف کا زمانہ حضرت مسیح سے پہلے کا ہے۔'' ''مریدانِ باصفا'' کا یہ باہمی تضاد تو اپنی جگہ پر مگر متنبی مرزا قادیانی صاحب نے بھی اپنی تکذیب آپ کی۔ کچھ ناقابلِ تردید مثالیں پیش کر کے خود اپنے موقف میں واضح شگاف ڈال دیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ حضرات ایک غلط نظریہ کو سچ ثابت کرنے کے لیے کیسے کیسے جھوٹ بولتے، لکھتے اور چھاپتے ہیں۔

مرزا جی نے کتاب چشمۂ مسیحی کے ص۲۵ اور اخبارات بدر و حکم ۱۹۰۶ء میں لکھا ہے جس کی نسبت محقق انگریزوں کا بھی یہی خیال ہے کہ اس کی سوانح عمری، ولادتِ مسیح سے پہلے مرتب ہو چکی تھی۔ ۵۵

مرزا جی کے اس نظریہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یوزآسف کا زمانہ حضرت مسیح سے پہلے کا ہے تبھی تو ولادتِ مسیح سے قبل یوزآسف کی سوانح کے ترتیب کا زمانہ قبول کرتے ہیں۔ ایسا تو نہیں ہوسکتا کہ ایک شخص پیدا تو بعد میں ہو مگر اُس کی سوانح قبل ولادت ہی ترتیب و تصنیف اور اشاعت کی منزلوں سے گذر کر عوام کے ہاتھوں تک پہنچ گئی ہو۔

مرزا جی کا ایک اور دھماکہ خیز بیان ملاحظہ کریں ''وفاتِ مسیح کے متعلق ایک دوسرے مقام کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مسیح ابن مریم...... جبکہ وہ جلیل میں جا کر کچھ عرصہ بعد فوت ہوا۔'' ۵۶

''حیاتِ مسیح'' یا ''وفاتِ مسیح'' میرا اس وقت موضوع نہیں بلکہ ''مفروضہ قبر'' کی غلط نشان دہی کرنے کا ازالہ اور مسخ شدہ تاریخ کے چہرے کو دوبارہ درست کر کے اہلِ علم کے سامنے حقائق پیش کر دینا ہی اس وقت میرا مقصود ہے۔ مرزا صاحب نے اپنی اس تحریر میں ''وفاتِ مسیح'' ان کے وطن ''جلیل'' میں تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا اس تحریری اعتراف کی روشنی میں اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر بفرضِ محال ہم حضرت عیسیٰ کی موت اگر ان کے وطن ''جلیل'' میں تسلیم کر لیں تو ان کی قبر کشمیر کے شہر سری نگر کے محلہ خانیار میں کیسے ہوگئی؟ کیا اس زمانے میں حضرت کا ''جسد خاکی'' بذریعہ ''طیارہ'' اتنی ''طویل مسافت'' کو طے کر کے کشمیری شہر سری نگر میں لایا گیا تھا؟ یعنی بقول شاعر ''اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا''۔

کیا قادیانی صاحبان اس سوال کی روشنی میں اپنے موقف کی حمایت میں کوئی ٹھوس اور واضح دلیل ہمیں اطمینان قلب کے لیے فراہم کر سکتے ہیں؟

نیز دیگر مؤرخین کی تحقیق کی روشنی میں کشمیر میں حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیا کے وجود کو بھی تسلیم کرتے ہیں؟

اگر ہاں تو پھر محلہ خانیار والی قبر صرف حضرت عیسیٰ کے لیے مخصوص کیوں...... حضرت موسیٰ یا دیگر اور اسرائیل سے آئے انبیا کے لیے مختص کیوں نہیں؟ اور اگر نہیں تو ان مؤرخین کی تحقیق کو ردّ کرنے کا قادیانی معیار کیا ہے، واضح کیا جائے؟ دورِ حاضر کے قادیانی صاحبان اپنے آپسی تضاد کو دور کرنے کے لیے اور رفع شبہات کے لیے کیا طریقۂ کار اختیار کریں گے؟

<u>مرزا صاحب کا دعویٰ نقد و نظر کی دنیا میں:</u> متنبّی مرزا غلام احمد قادیانی صاحب اپنی تصنیف لطیف ضمیمہ براہینِ احمدیہ جز پنجم میں ارشاد فرماتے ہیں:

''اور کشمیر کی تاریخی کتابیں جو ہم نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں۔ جو ہمارے پاس موجود ہیں اُن سے بھی مفصلاً معلوم ہوتا ہے ایک زمانہ میں جو شمار کی رو سے ''دو ہزار'' برس گذر گیا ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا۔ جو نبی اسرائیل میں تھا۔ اور شاہزادہ نبی کہلاتا تھا۔ اسی کی قبر محلہ خانیار میں ہے جو یوز آسف کی قبر کر کے مشہور ہے۔'' ۵۷

ہم نے اس حوالے کو اپنے سابقہ صفحات میں بھی ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں ہم نے شہزاد گیت، مبعوثیت، اسرائیلی نبی اور یوز آسف کی حقیقت کو مستند ماخذ کی روشنی میں اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔

لیکن اس حوالے کا ایک پہلو جو ہنوز تشنہ طلب ہے اس پر بھی روشنی ڈالنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ اہم پہلو اس حوالے میں مرزا صاحب کا مندرجہ ذیل دعویٰ ہے۔ جیسا کہ مرزا صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

''اور کشمیر کی تاریخی کتابیں جو ہم نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں۔ الخ''

قبر مسیح کے تعلق سے مرزا صاحب نے اپنے دعویٰ کی حمایت میں کشمیر کی تاریخی کتابوں کا ذکر بہت طنطنے سے کیا ہے۔ ہم نے بھی کچھ تاریخی کتب کا مطالعہ کیا۔ لیکن ان میں ایسی کوئی بات نہیں پائی جس سے مرزا صاحب کے دعوے کی من وعن تصدیق ہو۔ مندرجہ ذیل کتب سے اپنے موقف کی واضح نشاندہی بلا کسی توجیہ وتاویل کے اگر مرزائی صاحبان کریں تو ان کا فنِ تاریخ پہ بڑا احسان ہوگا۔

کتب تاریخ کشمیر

بزبان سنسکرت

۱۔ تاریخ شاستری۔ معروف۔ تاریخ رتنا کر۔ پنڈت رتنا کر

۲۔ راج ترنگینی۔ پنڈت کلہن

۳۔ زینہ ترنگی۔ ضمیمہ راج ترنگینی۔ پنڈت زوند راج

۴۔ تاریخ اودھ بٹ۔ ضمیمہ زینہ ترنگی

۵۔ راج وتی پتا کا۔ پراجیا بیٹ

بزبان فارسی

۱۔ وقائع ملک کشمیر

۲۔ تاریخ کشمیر (فارسی ترجمہ راج ترنگینی۔ مترجم ملا شاہ محمد شاہ آبادی۔ مقدمہ وتصحیح ڈاکٹر صابر آفاقی)

۳۔ تاریخ ملا نادری

۴۔ تاریخ قاضی حمید

۵۔ تاریخ منتخب التواریخ۔ حسن بیگ

۶۔ تاریخ سید علی

۷۔ تاریخ حیدر ملک۔ ملک حیدر

۸۔ بہارستانِ شاہی۔ سید مہدی کشمیری

۹۔ واقعاتِ کشمیر

۱۰۔ تاریخ نافعی

۱۱۔ تاریخ مولوی ہدایت اللہ متو

۱۲۔ تاریخ واقعاتِ نظامیہ۔ مولوی نظام الدین محمد

۱۳۔ شاہنامۂ کشمیر

۱۴۔ باغ سلیمان۔ منظوم۔ میر سعد اللہ شاہ آبادی

۱۵۔ لب التواریخ۔ ملا بہا الدین

۱۶۔ تحقیقات امیری۔ خواجہ امیر الدین

۱۷۔ منتخب التواریخ۔ منشی نرائن کول

۱۸۔ مجموعۂ تواریخ۔ بیربل پنڈت کاچرو

۱۹۔ گلزار کشمیر۔ دیوان کرپا رام

۲۰۔ خلاصۃ التواریخ۔ مرزا سیف الدین

۲۱۔ موجز التواریخ۔ مرزا سیف الدین

۲۲۔ وجیز التواریخ۔ ملا عبد النبی خانیاری

۲۳۔ تاریخ کشمیر۔ پنڈت دیارام کاتب

۲۴۔ بوادر الاخبار۔ رفیع الدین احمد غافل

۲۵۔ گوہر نامۂ عالم۔ محمد اسلم منعمی

۲۶۔ تاریخ حسن۔ پیر سید غلام حسن

۲۷۔ تحائف الابرار (تاریخ کبیر)۔ حاجی محمد محی الدین

مندرجہ بالا کتابیں تاریخ کشمیر میں "سنگ میل" کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ کتابیں وہ بنیادی مآخذ ہیں جن سے مستثنیٰ ہو کر تاریخ کشمیر کے ابجد سے بھی واقفیت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اور ان کتب سے قادیانی صاحبان کا موقف ثابت نہیں ہوتا۔ پنڈت کلہن کی تصنیف "راج ترنگینی" کشمیری تاریخ میں بنیادی حیثیت کی حامل ہے۔ اور اس میں کہیں بھی "مسیح کی قبر" کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ ۱۹۷۵ء میں اس کا فارسی ترجمہ ادارۂ فارسی برائے ایران و پاکستان، راول پنڈی سے ڈاکٹر صابر آفاقی کے مقدمہ وتصحیح کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ مرزائی صاحبان اپنی بات کو منوانے کے لیے کہاں کہاں سے دور کی کوڑی لائیں گے یہ مجھے نہیں معلوم۔ لیکن حقائق کی دنیا میں ان کا یہ مفروضہ کبھی بھی سچ ثابت نہیں ہوسکتا۔ نہ عقلاً اور نہ نقلاً۔ نہ قرآن و حدیث سے اور نہ مستند کتب تواریخ سے۔ یہ دین و مذہب سے متعلق ایک تاریخی مغالطہ تھا جس کا ازالہ کرنا ازحد ضروری تھا اور میں نے تمام تر جدوجہد کے بعد اپنی سی کوشش کی ہے اس میں کہاں تک کامیاب ہوں۔ اس کا فیصلہ اہل علم کی باوقار رائے پر منحصر ہے۔ پھر بھی۔

اس میں لہو جلا ہو یا کہ ہمارا دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

حوالہ:

۱۔ نیا عہد نامہ۔ انجیل یوحنا باب ۱۷ آیت ۳

۲ نفس مصدر انجیل یوحنا باب آیت

۳ نفس مصدر انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۴۰۔۳۹

۴ نفس مصدر انجیل متی باب ۵ آیت ۱۷

۵ توحید سے تثلیث تک۔ محمد شریف قریشی۔ادیب اشاعت اوّل ۱۹۷۴ء ناشر دینی مشن، دہلی ص ۵

۶ نیا عہد نامہ کلیسوں۔ باب ا۔ آیت ۱۹۔۲۰

۷ نیا عہد نامہ۔ لوقا، باب ۲۴، آیت ۳۶

۸ نیا عہد نامہ۔ اعمال۔ باب ا، آیت ۳

۹ نیا عہد نامہ۔ اعمال۔ باب ا، آیت ۷

۱۰ القران الکریم۔ سورۃ النساء، آیت ۱۵۶ تا ۱۵۹

۱۱ القران الکریم۔ سورۃ آل عمران، آیت ۵۴

۱۲ ازالۂ اوھام۔ غلام احمد قادیانی۔ متنبی۔ سنہ اشاعت ندارد، مشمولہ روحانی خزائن جلد ۳ ناشر ناظر اشاعت برطانیہ ص ۶۴۳

۱۳ مسیح ہندوستان میں۔ غلام احمد قادیانی متنبی سنہ اشاعت ندارد، ناشر صدر انجمن احمدیہ قادیان بھارت

☆ نوٹ: آیت میں شامل لفظ "متوفیك" پر دلائل کے ساتھ گفتگو رسالہ "سیف ربانی بر جید قادیانی" میں کی گئی ہے۔ قادیانی دلائل کا جائزہ اس رسالہ میں ملاحظہ فرمائیں جو مختصر ہونے کے باوجود معلومات سے پُر ہے۔ (نوشاد چشتی)

۱۴ مجلس تحفظِ ختم نبوت کے کارنامے۔ پمفلٹ۔ ناشر ناظر دعوت و تبلیغ صدر انجمن احمدیہ، قادیان، بھارت ص ۳۔۴

۱۵ آزاد کشمیر، ایک سیاسی جائزہ۔ مرزا شفیق حسین۔ مؤرخ۔ طبع اوّل ۱۹۹۰ء ناشر قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد ص ۱۴

۱۶ ایضاً ص ۱۴۔۱۵

۱۷ Where did Jesus Die? by J. D. Shams, Edition:11, 1988 pubished by. Nazarat dawat-e-tabligh- Qadian-India, P.151

۱۸ رازِ حقیقت۔ غلام احمد قادیانی۔ متنبی۔ مشمولہ روحانی خزائن جلد ۱۴۔ نومبر ۱۹۸۴ء ناشر ناظر اشاعت لندن برطانیہ ص ۴۷

۱۹ ضمیمہ براہین احمدیہ۔ حصہ پنجم۔ غلام احمد قادیانی۔ متنبی۔ مشمولہ روحانی خزائن جلد ۲۱۔ نومبر ۱۹۸۴ ناشر ناظر اشاعت لندن برطانیہ ص ۴۰

۲۰ نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہور الحسن ناظم۔ مؤرخ۔ اشاعت اوّل ۱۳۵۲ھ/ ۱۹۳۳ء مطبع جید برقی پریس، بلیماران، دہلی۔ ص ۳۸۲

۲۱ ایضاً ص ۲۸۲

۲۲ ایضاً ص ۲۸۴

۲۳ Where did Jesus Die? by J. D. Shams, P. VII pubished by. Nazarat dawat-e-tabligh- Qadian-India, P.151

۲۴ نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہورالحسن ناظم۔ مؤرخ۔ اشاعت اوّل ۱۳۵۲ھ/۱۹۳۳ء مطبع جید برقی پریس بلیماران، دہلی۔ ص ۲۷۳۔تا ۲۵۱

۲۵ نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہوالحسن ناظم۔ مؤرخ ص ۲۷۵

۲۶ Where did jesus die by. J. D. Shams P.VII

۲۷ سری نگر میں خانیار ایک محلّہ کا نام ہے جہاں حضرت آرام فرما ہیں۔ اس محلّہ میں ایک چشتی خانقاہ بھی ہے۔ صاحب تاریخ حسن لکھتے ہیں: ''خانقاہِ چشتی: عنایت اللہ خاں در ایامِ حکومت در ۱۰۵۲ھ برائے خادماں میاں ہاشم چشتی در محلّہ خانیار بہ ترتیب عجیب آباد کردہ بود۔''

مؤرخین کے نزدیک ۱۰۵۲ھ بمطابق ۱۶۴۲ء غالباً سہو کتابت ہے۔ صحیح اور راجح قول حضرت چشتی علیہ الرحمہ کے آنے کا ۱۱۲۳ھ تا ۱۱۲۷ھ کے درمیان کا ہے۔ صاحب تاریخ حسن کا بھی یہی خیال ہے۔ ملاحظہ کریں۔ (تاریخ حسن۔ پیر غلام حسن کھویہامی۔مؤرخ۔ اشاعت ثانی ۱۹۵۴ء ناشر شعبہ تحقیق و اشاعت سری نگر، ص ۳۹۔ ۳۵۰، جلد ۱)

۲۸ نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہوالحسن ناظم۔ مؤرخ۔ ص ۲۸۱۔۲۸۲

۲۹ نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہوالحسن ناظم۔ مؤرخ۔ ص ۲۸۲۔۲۸۳

۳۰ مؤرخ عبدالقدیر لکھتے ہیں:

الف: ''تخت سلیمان یا شنکر اچاریہ''۔ حضرت داؤد (علیہ السلام والصلوٰۃ) کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام فلسطین میں جلیل القدر پیغمبر بھی تھے۔ اور بادشاہ بھی۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ جو امن، نیکی اور خوش حالی آپ کے عہد مبارک میں تھی یہی دنیا کے کسی اور ملک اور کسی دور میں نہیں ہوئی۔ چرند، پرند، ہوا، جن و پری بھی مخلوق ان کے تابع و فرمان تھے۔ اور آپ ایک تخت پر سفر فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے سری نگر کی اس پہاڑی پر قیام فرمایا اور اس کا نام تخت سلیمان پڑ گیا۔ بہت مدّت بعد اس پر شنکر اچاریہ نے بیٹھ کر تپسیا کی۔ تو ہندو شنکر اچاریہ کہنے لگے۔ اب دونوں نام استعمال ہوتے ہیں۔

(''کشمیر جنت نظیر'' مولف: عبدالقدیر مؤرخ۔ اشاعت اوّل جنوری ۱۹۴۹ء ص ۹۸۔۹۹۷)

ب: ایک فارسی مؤرخ لکھتے ہیں: ''شہر سری نگر در حصّۂ شمالی شبر کوہ ماراں دل کشاست و جانب گوشۂ سرحد شرقی آں ''کوہ سلیمان'' روح افزاء وصحت۔ مغرب آں عید گاہ میدانے است۔ وقف کردہ بر محمد ہمدانی درازی آں ہزار وشش صد قدم و پہنائی آں پانصد قدم۔''

("تاریخ حسن" میر غلام حسن کھویہامی۔ مؤرخ، اشاعت ۱۹۵۴ء ناشر شعبۂ تحقیق واشاعت سری نگر۔ جلد اوّل، ص ۲۳۶)

۳۱ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۸۴

۳۲ نگارستانِ کشمیر۔ ص ۲۸۴۔۲۸۵

۳۳ مسیح ہندوستان میں۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ متنبی۔ ص ۱۰۰۔۱۰۳

۳۴ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ مؤرخ۔ ص ۲۸۵

۳۵ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۸۷

۳۶ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۸۷۔۲۸۸

۳۷ نگارستانِ کشمیر۔ ص ۲۸۸۔۲۸۹

۳۸ تاریخ کبیر کشمیر۔ ص ۲۸۹

۳۹ تاریخ حسن۔ پیر غلام حسن کھویہامی ص ۳۹۵، جلد اوّل

۴۰ نگارستانِ کشمیر، ناظم۔ ص ۲۹۱

۴۱ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۹۱

۴۲ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۸۹

۴۳ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۸۹

۴۴ نگارستانِ کشمیر۔ ناظم۔ ص ۲۹۴

۴۵ زیشٹی شور کا تذکرہ پنڈت کلہن نے راج ترنگینی میں کیا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

۴۶ تاریخ حسن ص ۳۹۴۔۳۹۵

۴۷ ایضاً ص ۳۹۶

۴۸ کشمیر سلاطین کے عہد میں۔ محب الحسن مورخ، اشاعت ۱۹۶۷ء/ ۱۳۸۶ھ ناشر دار المصنفین اعظم گڑھ

۴۹ راج ترنگینی۔ فارسی مترجم۔ ملا شاہ محمد شاہ آبادی، اشاعت ثانی ۱۹۷۵ء۔ ایران پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف پرشین، راولپنڈی پاکستان، ص ۳۷۹

۵۰ آزاد کشمیر ایک سیاسی جائزہ۔ مرزا شفیق حسین، ص ۲۷

۵۱ ایضاً ص ۲۷

۵۲ نگارستان کشمیر ص ۲۸۹

۵۳ ایضاً ص ۳۹۰

۵۴ نگارستانِ کشمیر ص ۲۹۰

۵۵ ازالۂ اوہام۔ غلام احمد قادیانی۔ متنبی، مشمولہ روحانی خزائن، جلد ۳۔ ص ۳۵۴

۵۶ ضمیمہ براہینِ احمدیہ۔ مرزا غلام احمد قادیانی۔ متنبی۔

مذاہبِ ہند کی سیاسی ثقافت

از: ڈاکٹر محمد یونس قادری، ریسرچ اسکالر، کراچی

جس طرح دورانِ خون ہماری زندگی کی علامت ہے اسی طرح کلچر معاشرے کے لیے دورانِ خون کا درجہ رکھتا ہے۔ کلچر (ثقافت) اکتسابی یا ارادی یا شعوری طرزِ عمل کا نام ہے۔ اکتسابی طرزِ عمل میں ہماری وہ تمام عادات، افعال، خیالات، رسوم اور اقتدار شامل ہیں جن کو ہم ایک منظم معاشرے یا خاندان کے رکن کی حیثیت سے عزیز رکھتے ہیں۔ یا اُن پر عمل کرتے ہیں یا اُن پر عمل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں۔......۱
دوسرے لفظوں میں کلچر اس ذہنی، مادّی اور خارجی طرزِ عمل کے اظہار کا نام ہے جو باضابطگی کے ساتھ معاشرے کے افراد میں یکساں طور پر پایا جاتا ہے۔......۲

سیاسی ثقافت: ثقافت کا وہ حصہ جو سیاست کو متاثر کرے اور اس سے برتاؤ مختلف ہو اُسے ہم سیاسی ثقافت کہیں گے۔ مثلاً زبان، علاقہ، مذہب یہ سب سیاسی ثقافت میں شامل ہیں کیونکہ یہ عوامل بالواسطہ سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں۔......۳

سیاسی ثقافت کی چند اور تعریفات درج ذیل ہیں۔

المنڈ: یہ ایسے رجحانات، عقاید، اقدار اور مہارتوں کا مجموعہ ہے جو تمام معاشرے یا آبادی میں موجود ہوتی ہیں۔......۴

سڈنی وربا: سیاسی ثقافت موضوعی رجحان پیش کرتی ہے۔......۵

لیوسیئن پائی: یہ رویے، یقین اور جذبات کا ایسا مجموعہ ہے جو سیاسی نہج میں ترتیب اور معنی پیدا کرتا ہے۔......۶

عصر حاضر کے ہندوستان میں غیر الہامی مذاہب ہندومت، جین مت، بدھ مت، زرتشتی مت اور سکھ مت ہیں۔

ہندومت: جدید تحقیق کے مطابق تہذیب کا آغاز ہندوستان سے ہوا تھا۔ اس بات کی تائید موئن جوداڑو اور ہڑپا کے کھنڈرات بھی کرتے ہیں۔......۷ تاریخی اعتبار سے اسے ساڑھے تین ہزار سالہ قدیم مذہب کہا جاتا ہے۔ ہندو اقوام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر گستاولی بان ''تمدنِ ہند'' میں لکھتے ہیں: ہندو کئی بڑی اقوام کا مرکب ہیں۔ ہند کے قدیم باشندے سیاہ فام تھے۔ اگرچہ ہمیں وہ زمانہ قطعی طور پر نہیں معلوم ہے جب باہر کی قومِ تورانی اس ملک میں آئے جن کے رنگ زرد تھے۔ پھر سفید رنگ قومِ آریہ شمالی ہند میں

داخل ہوئے۔ چوتھی صدی عیسوی میں ہند پر پھر ایک نئی فوج کشی راج پوتوں کی ہوئی۔ یہ قوم جو بادشاہوں کی اولاد تھی اور جس کا ہر فرد بہادر اور آپس میں برابر تھا چھتری کے نام سے مشہور ہوئی۔ جس نے ایک خطہ راج پوتانہ قائم کیا۔ جاٹ، گجر اور سکھ تورانی اقوام سے ہیں۔ گیارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی فتوحات شروع ہوئیں۔ یہ فاتحین بھی نہایت مختلف الاصل تھے۔ ان میں عرب، ایرانی، افغانی اور مغل ملے جلے تھے اور انہوں نے ہند کی اقوام کو جو پہلے ہی سے مخلوط تھی اور زیادہ مخلوط بنا دیا۔ ......۸ ویدیں ان کی مقدس کتب ہیں۔ ......۹ جن کے ساتھ اُپنشدز، پُران، گیتا اور سماجی قوانین کے مجموعے شاستر بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ تری مورتی ان کا بنیادی عقیدہ ہے جس کے تحت تین خداؤں کا تصوّر کیا جاتا ہے۔ کائنات کا خالق، کائنات کی بقا اور کائنات کی تباہی و بربادی کا سبب جنہیں برہما، وشنو اور شیو کا نام دیا جاتا ہے، ہندو عقیدے کے مطابق تمام بڑے مصلحین وشنو کے اوتار تھے اور ابھی ایک اوتار باقی ہے۔ ......۱۰ ہندو اپنے مذہب کو نجات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جس کے حصول کے لیے وہ تین راہیں مانتے ہیں۔ راہِ عمل، راہِ علم اور راہِ تسلیم۔ ابتدائی زمانے میں راہِ عمل ہی کو سب سے زیادہ مذہبی اہمیت حاصل تھی۔ بعد ازاں راہِ علم اور پھر راہِ تسلیم کی اہمیت تھی لیکن اب راہِ عمل اور راہِ علم کا اثر کم ہوتا جارہا ہے اور راہِ تسلیم کا اثر بڑھ گیا ہے۔ ......۱۱ مشہور مسلمان مؤرخ، شاعر اور انشاء پرداز امیر خسرو ہندوؤں کے تصورِ وحدانیت کے بھی معترف تھے۔ وہ کہتے ہیں، ہندو ہمارے مذہب کے قائل نہیں لیکن اُن کے بہت سے عقاید ہم سے مشابہ ہیں۔ وہ خداوند تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی ہستی اور قدم کے معترف ہیں۔ ......۱۲ ہندو پتھر، جانوروں، آفتاب اور درختوں کو پوجنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ سب ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں اور وہ ان کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے آبا و اجداد انہیں پوجتے تھے۔ بقول صاحب آگرہ، ہندو تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتا کی پوجا کرتے ہیں۔ ......۱۳ عبداللہ المسدوی لکھتے ہیں: وہ (برہمن) بھی ہماری طرح توحید کے قائل ہیں سوائے اس کے کہ نبوت سے انکار کرتے ہیں۔ یہ براہمہ (برہمنوں) کا مذہب ہے۔ ......۱۴ شیخ عبدالحق محدّث دہلوی ہندوؤں کے ایک فرقے کے بارے میں لکھتے ہیں:
''کافروں کی ایک قوم ہے جنہیں بشنو کہا جاتا ہے۔ ان کے یہاں گانا، رقص اور ایسے حالات ہیں جن کے ذریعے شیطان انہیں گمراہ کرتا ہے۔ یہ لوگ کرشن کے معتقد ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ شہر میں دہی بیچنے کے لیے آنے والی عورتوں کے پیچھے پھرتے ہیں۔ اُن سے عشق لڑاتے ہیں، انہیں بہلاتے پھسلاتے ہیں اور ان کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ ۱۵

ابوریحان البیرونی نے کتاب الہند (ج۔ ۱) میں ہندوؤں کی چند علامت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔ نہار منہ شراب پیتے ہیں، گائے کا پیشاب تھوڑا تھوڑا پیتے ہیں لیکن اُس کا گوشت نہیں کھاتے۔ منہ سے

پہلے پاؤں دھوتے ہیں۔ غسل کر کے ہم بستری کرتے ہیں۔ سارا کام عورتیں کرتی ہیں ان کے شوہر آرام کرتے ہیں۔ اپنی عیدوں میں بدن پر عطر کی جگہ کیچڑ ملتے ہیں۔ مرد عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں۔ کان میں آویزے، ہاتھوں میں کنگن اور ہاتھ و پاؤں کی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ ......۱۶ ان کے جسموں پر گھنے بال ہوتے ہیں اور یہ رقص و سرور کے رسیا ہوتے ہیں۔ ......۱۷ یہ قوم نہایت کمزور، پست ہمت اور کائیاں ہوتی ہے نیز ان کے اخلاق میں خوشامد اور لجاجت ہے۔ ......۱۸ مرنے کے بعد اپنے مُردوں کو جلا کر ......۱۹ راکھ کو دریائے گنگا میں بہا دیتے ہیں۔ ۲۰

بدھ مت: سن عیسوی سے چھ سو برس پیش تر ہندستان میں مذہب محض رسم و رواج کا مجموعہ رہ گیا تھا۔ برہموں کے مذہبی استبداد کے سامنے قدیم رشیوں کی روحانی تعلیمات سلب ہوگئی تھیں۔ تینتیس (۳۳) کروڑ دیوتاؤں کی پرستش اور آواگون کے چکّر نے دماغوں کو مختل کر دیا تھا۔ ایسی جہالت کے زمانے میں سرزمینِ ہند کا لقمان یعنی گوتم بدھ نے ادنیٰ و اعلیٰ سب پر سچّی دینی تعلیم کے ذریعے نجاتِ ابدی کا دروازہ کھول دیا۔ ......۲۱ بدھ مت کے بانی گوتم ہیں جن کا لقب ساکھیا منی تھا جو بعد میں بدھ کے نام سے موسوم ہوئے۔ آپ نیپال کے جنوب میں واقع کپل وستو کے مقام پر پانچویں صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ ......۲۲ بدھ مت کی ابتدا کا زمانہ قصص و حکایات کا زمانہ ہے۔ اس مذہب کے ابتدائی حالات جو ہم تک پہنچے ہیں ان کا شمار بھی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ سکندر اعظم کی فوج کشی کے بعد تقریباً ۲۵۰ قبل مسیح میں جب بدھ مذہب تمام ہندستان کا شاہی مذہب بن گیا، اُس وقت سے ہمیں اس مذہب کے بارے میں اصل حالات معلوم ہونے لگے۔ صاحب کتاب الہند، بدھ مذہب کے بارے میں لکھتے ہیں: فرقہ شمنیہ (بدھ مذہب) اگرچہ برہموں سے سخت عداوت رکھتا ہے پھر بھی بمقابلہ دوسرے ہندو غیر مذہب کے ہندوؤں سے زیادہ قریب ہے۔ قدیم زمانے میں خراسان، فارس، عراق، موصل (حدودِ شام) تک بدھ مذہب کے پیروکار تھے۔ زرتشت کے ظہور ہونے کے بعد مذکورہ علاقوں میں مجوسیوں کی تعداد بڑھنے پر یہ مذہب بلخ سے مشرقی اطراف میں ہٹ آیا۔ ......۲۳ ہندستان میں بدھ مت کا زور و شور ۳۲۰ قبل مسیح تا ۵۰۰ عیسوی تک شمار کیا جاسکتا ہے۔ گوتم کی تعلیم کا ملخص یہ ہے کہ حیات مایہ آلام ہے اور تمنائے حیات جس کی بنا لذّاتِ جسمانی پر ہے مصائب کا پیش خیمہ ہے۔ اس لیے تمنا کا خون ہوجانا دراصل مصائب کا خاتمہ کردیتا ہے۔ لیکن یہ طریق سخت دشوار ہے اس لیے انسان کو چاہیے کہ اعمالِ ہشت گانہ کے ذریعے اس منزل کو طے کرے۔ وہ اعمال دُرستیِ ایمان، خلوصِ نیت، حق گوئی، راست روی، اکلِ حلال، صدقِ طلب، تصفیۂ باطن اور استغراقِ کامل ہیں۔ ......۲۴ بدھ مت کے پیروکار ایک طرح سے تناسخ کے قائل ہیں لیکن روح کے قائل نہیں۔ ظاہر ہے روح کے بغیر تناسخ کیسے ہوسکتا ہے۔ اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ

انسان کے اعمال فنا نہیں ہو سکتے۔ جب انسان مرجاتا ہے تو اعمال کے لحاظ سے ایک نیا وجود پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ بُدھ کی تعلیمات کے جس میں نیکی، عام ہمدردی اور تزکیۂ نفس کی تلقین تھی، بُدھ مت کی اشاعت و ترقی کا اہم ذریعہ راجہ اشوک کے بُدھ مذہب قبول کرنے کی وجہ سے ہوا۔ جس کی بنا پر یہ راج دھرم (سلطنت کا مذہب) بن گیا۔ چینی سیاح ہیون سانگ نے اپنے سفر نامے میں بُدھ دارالعلوموں کا ذکر کیا ہے۔ نالندہ کی خانقاہ جو کہ ایک بہت بڑا دارالعلوم تھی یہاں کئی ہزار مونک (Monk بُدھ درویش) تھے جو بلحاظ علم وفضل خاص امتیاز رکھتے تھے۔ لوگ ان کی بہت وقعت و توقیر کرتے تھے۔ اب بھی دنیا کی آبادی کا تقریباً ایک تہائی حصہ اس مذہب کے ماننے والوں کا ہے۔ ......۲۵ بُدھ مت کے پیروکار مرنے کے بعد لاش کو دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ ۲۶

زرتشتی مذہب: مؤرخین اس مذہب کی تاریخ چھ ہزار سے دو ہزار قبل مسیح متعین کرتے ہیں۔ اس مذہب کے بانی زرتشت اعظم ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا میں زرتشت کے پیروکار پارسی کہلاتے ہیں۔ ......۲۷ زرتشت آذر بائی جان کے رہنے والے تھے۔ جو اُن کے نبی کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ جن پر کتاب ''زمزمہ'' اُتری تھی۔ ......۲۸ زرتشت نے بلخ آکر مجوسیت کی تبلیغ شروع کی جس کے نتیجے میں گشتاسپ نے اُن کا مذہب اختیار کیا۔ گشتاسب کے بیٹے اسفندیار نے مشرق ومغرب کے کئی شہروں میں بحیرہ اور بصلح چین سے روم تک مجوسیوں کے آتش خانے قائم کیے۔ پھر بعد کے بادشاہوں نے فارس اور ایران کو اس مذہب کے لیے مخصوص کرلیا۔ ......۲۹ اُن کی مقدس کتاب ''اوشا'' ہے جس کی متعدد تفسیروں کو ژند کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دین کرو، بندیش، اردا ویراف نامہ، دادستاں دینک وغیرہ خاص الہامی کتب سمجھی جاتی ہیں۔ ......۳۰ ان کے ہاں دو خداؤں کا تصور ہے، خدائے خیر اور خدائے شر۔ خدائے خیر یعنی اہورامزدا کی سات صفات ہیں جو امتیاز سپنتا کہلاتی ہیں یعنی حقیقتِ اعلیٰ، غیر فانی، متقی، قوی، عقلِ کُل، تمام نعمتوں کے مالک اور راستی پر قائم رہنا، اُن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہ حضرات حیات الممات، حساب و اعمال اور جنت و دوزخ کے قائل ہیں۔ اس مذہب میں پاک وصاف رہنا، محنت ومشقت سے روزی کمانا اور غریبوں کی مدد کرنا نیک آدمی کی پہچان ہے۔ سستی و کاہلی اور بے کاری قابلِ نفرت ہے۔ یہ اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کرتے اس لیے دنیا میں بہت کم ہیں۔ اب یہ مذہب ہندستان کے کچھ علاقوں جیسے گجرات، ممبئی اور کراچی تک محدود ہے۔ کراچی میں پارسیوں کی عبادت گاہ صدر ٹاؤن میں ڈاکٹر داؤد پوتہ روڈ پر واقع ہے جس کے دروازوں پر تاحال یہ بورڈ آویزاں ہے: H. J. BEHRANA PARSI DAR-E-MEHAR

جَین مت: اس مذہب نے بھارت میں پانچویں صدی قبل مسیح میں جنم لیا۔ جیوہتھیا کے خلاف اہنسا کا پیام بر اور سماجی اصلاح اس کا مسلک تھا۔ اس کے بانی وردھمان مہاویر (۷۷ھ ق م) تھے۔ اس مذہب کے

پیروکار چوبیس جنوں یا سنتوں کو مانتے ہیں۔ خدا کے قائل نہیں۔ ذات، پات اور ویدوں کو نہیں مانتے۔ نروان حاصل کرنا ان کا آدرش ہے۔ اس مذہب کے ماننے والوں کی موجودہ تعداد سولہ لاکھ ہے۔ ان کے بعض مندر ہندستان میں فنِ تعمیر کا نادر نمونہ ہیں۔ جین مت کے پیرو جنی یا جین کہلاتے ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے، چھنا ہوا پانی پیتے ہیں، ناک کے نتھنوں پر تہہ کیا ہوا کپڑا رکھتے ہیں اور چلتے وقت کپڑے کی دھجیوں کی ایک چتور سے راستہ صاف کرتے جاتے ہیں کہ کہیں جیوہ ہتھیا نہ ہو جائے۔......۳۱

یہ مذہب مسلم فتوحات کے وقت برِصغیر میں زمانہ مابعد کی نسبت زیادہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کا مرکز جزیرہ نما گجرات تھا۔ ان کی سب سے بڑی معاشرتی خصوصیت یہ ہے کہ ہر قسم کے جاندار کی جان کا حد سے زیادہ احترام کرتے ہیں اور جیوہ ہتھیا سے بچتے ہیں۔ مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے ۹۹۰ھ/۱۵۸۲ء میں جینیوں کے ساتھ مذہبی رابطہ کیا اور پہلے ہیرو اور بعد ازاں بھانو چندر کو دربارِ مغلیہ میں بلایا۔ جینیوں کے حق میں بہت سے اکبری فرامین کی توثیق بادشاہ جہانگیر نے کی۔......۳۲

سکھ مت: سکھ مذہب ہندستان کی پیداوار ہے۔ اس کے بانی گرو نانک (۱۴۶۹۔۱۵۳۹ء) کی پیدائش صوبۂ پنجاب کے شہر لاہور سے پچاس میل دور ایک گاؤں ننکانہ صاحب میں ہوئی۔......۳۳ ان کے والد ایک مسلمان زمیندار کے یہاں ملازم تھے۔ میکنیکن متعدد حوالوں سے شہنشاہ اکبر کا یہ قول نقل کرتا ہے:
''کھتری کٹر ہندو ہوتے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انہوں نے سکھوں کو ایک مذہب اور بانی مذہب عطا کیا حالانکہ وہ شاذ ہی سکھ مذہب کے پیروکار ہیں۔'' ......۳۴ کبیر کی طرح نانک کی تعلیمات کا بنیادی مقصد بھی ہندو مسلم اتحاد تھا، فرماتے ہیں: ''م محمد من تو من کتاباں چار من خدائے پاک نوں سچا ہے دربار۔'' اپنے متعلق نانک کا کہنا ہے کہ کائنات میں صرف ایک خدا ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور نانک اس کا خلیفہ ہے جو حق کی تعلیم دیتا ہے۔ دراصل نانک نے حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات و اسوۂ حسنہ کو اپنا اسوۂ حیات بنایا۔ نانک کے پیروکار سکھ کہلاتے ہیں۔ گرنتھ صاحب ان کی مذہبی کتاب ہے۔ نانک کو گرو جی کہتے ہیں۔ اُن کے بعد نو۹ گرو ہوئے۔ پانچویں گرو ارجن سنگھ نے نانک کے ملفوظات کو یکجا کیا۔ سکھ تناسخ کے قائل ہیں، خوب شراب پیتے ہیں اور ہندوؤں کے تہوار بھی مناتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہوں (گردوارے) میں بت نہیں ہوتے بلکہ اپنی مقدس کتاب (گرنتھ صاحب) کو سجدہ کرتے ہیں۔ ان میں پانچ کاف یعنی کیس، کنگھا، کرپان، کچھ اور کڑا کی پابندی ضروری ہے۔ اس وقت دنیا میں سکھوں کی تعداد پانچ کروڑ سے زاید ہے۔......۳۵

ہندو مت کسی دور میں ایک پُر امن اور شریفانہ مذہب سمجھا جاتا تھا مگر عصرِ حاضر میں اس کے پیرو کاروں میں عدم برداشت اور انتہا پسندی کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ انتہا پسند ہندو نئی تعلیمی پالیسی کے

تحت تاریخ اور نصابی کتب میں من چاہی تبدیلیاں کر رہے ہیں۔ آر ایس ایس ......۳۶ کی ایک شاخ وڈیا بھارتی جس کے تحت بھارت میں بیس ہزار نجی ہندو اسکول کام کر رہے ہیں، کے سربراہ دینا ناتھ بترا کا کہنا ہے کہ تنظیم کی جانب سے تاریخ کی کتابوں میں تبدیلیوں کے لیے چلائی جانے والی مہم کا مقصد درسی کتابوں کو جدید خطوط پر اُستوار کرنا ہے۔ برطانیہ سے آزادی کے بعد بھارت میں مارکسٹ عناصر کا غلبہ رہا ہے جس کا مقصد لا مذہبیت پھیلانا، ہندوؤں کے درمیان ثقافتی خود اعتمادی کو نقصان پہنچانا اور ہندو ازم کو کمزور کرنا ہے۔ ان عناصر میں مزید دو عناصر مسلمان اساتذہ یا ملا اور میکالے (جو وکٹورین عہد کے براؤن اسکن انگریز پیدا کرنے کے حامی ہیں) شامل ہیں۔ بی جے پی کے سابق وزیر تعلیم اور آر ایس ایس کے ایک پرانے رکن ایم ایم جوشی کا کہنا ہے کہ بھارت ایک مذہبی ملک ہے اس لیے ہم نوجوانوں میں کسی بھی قسم کے شکوک وشبہات پیدا نہیں کرنا چاہتے۔ ایک اور ممتاز تاریخ داں سومیت سرکار کہتے ہیں کہ نئے نظر ثانی شدہ نصابِ تعلیم میں ہر اس مواد کو حذف کر دیا جائے گا جو ہندو مذہب کے خلاف یا مذہبی طور پر حساس ہوگا۔ ہندستان کی قدیم تاریخ کی ماہر خاتون پروفیسر تھاپر کا کہنا ہے کہ بھارت کی نئی تعلیمی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ جو مذاہب اس کی نظر میں پسندیدہ اور مقبول نہیں اُنہیں فروغ دیا جائے۔ ان میں سکھ مذہب، جین مذہب اور بدھ مت شامل ہیں اور جو مذاہب باہر سے آئے انہیں نظر انداز کر دیا جائے یا کمزور صورت میں پیش کیا جائے۔ ان میں اسلام اور عیسائی مذاہب شامل ہیں۔ ......۳۷ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے قبل ہندستان میں تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے اس لیے ان کے ذہن میں ملی جلی اور وسیع النظر (سیکولر حکومت) کا کوئی تصور نہ تھا۔ اسلام نے انہیں مذہبی رواداری، انسانی مساوات اور عدل و انصاف میں غیر جانب داری سکھائی۔ کئی مسلم سلاطین نے تو گائے کے ذبیحے پر مکمل پابندی عائد کی۔ ......۳۸ اور چونکہ مسلمانوں کے پورے دورِ حکومت میں ان کا یہ سیکولر رویہ قائم رہا اس لیے خود اس ملک کے باشندوں کی ذہنی اصلاح اور تربیت کے باعث ان کے کٹر مذہبی پن میں بھی اعتدال پیدا ہوگیا۔ ......۳۹ اس مذہبی رواداری کا اعتراف مشرق و مغرب کے کئی مورخوں اور سیاسی مفکرین نے کیا۔ ان میں ایشوری پرشاد ......۴۰، بنی پرشاد سکسینہ ......۴۱، پروفیسر وی ڈی مہاجن ......۴۲، ابن حسن ......۴۳، جی بی میلسن ......۴۴، آر سی مجمدار ......۴۵، سری رام شرما ......۴۶ اور محمود احمد الساداتی ......۴۷ شامل ہیں۔

بھارت کے اس زعفرانی انقلاب کے تحت علمِ نجوم، ویدک، ریاضی اور دیگر کورسوں کو اسکول سے لے کر یونی ورسٹی کی سطح تک درسی کتابوں میں پڑھانے کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتوں نے ملک کی تاریخ میں جو کردار ادا کیا ہے اسے ختم کر دیا جائے۔ حکومت کے اس سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تعلیمی

نظام میں ان تبدیلیوں کے سبب نہ صرف اہم تاریخی مفروضوں کا بھی خاتمہ ہو جائے گا بلکہ ایک ایسی تاریخ جنم لے گی جس کے مطابق ہندو مذہب ایک بہت موثر اور طاقت ور قوت کے طور پر اُبھرنے کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی کے اُفق کو بھی چھو لے گا۔

حواشی و مآخذ

۱۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (ج۔۱)، لاہور۔ ص ۳۹۱

۲۔ ڈاکٹر جمیل جالبی (۱۹۸۵ء) طبع سوم۔ پاکستان کلچر۔ کراچی: فضلی سنز، ص ۴۶

۳۔ Helton Singer. "The concept of culture". International Encyclopedia of the Social sciences. (Vol-3). pp. 527-543.

۴۔ Almond, G. A. (1976) Comparative Politics: A development Approach. New Delhi: Oxford and 1B H. p-2

۵۔ Sidney Verba. (1965) Comparative Political Culture. Princeton: Princeton University Press. p-513

۶۔ Lucian Pye. "Political culture." International Encyclopedia of the Socail Sciences. (Vol. 12) .p-218.

۷۔ موئن جوداڑو کے قدیم آثار صوبۂ سندھ کے شہر لاڑکانہ سے تقریباً ۲۹ کلومیٹر کے فاصلے پر ۱۹۲۲ء میں اتفاقاً دریافت ہوئے۔ ڈائریکٹر آثارِ قدیمہ سر جان مارشل کی نگرانی میں کھدائی ہونے والے اس شہر کے آثار تقریباً ساڑھے تین ہزار سال قبل کے ہیں۔ ہڑپہ کے کھنڈرات صوبۂ پنجاب کے شہر ساہیوال سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلے پر دریافت ہوئے۔ دونوں شہروں کے درمیان ۶۴۰ کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ جدید تحقیق کے مطابق یکساں عمارات اور رہن سہن میں مطابقت ظاہر کرتی ہے کہ یہ ایک ہی وقت موجود رہے ہوں گے۔

۸۔ ڈاکٹر گستاولی بان۔ (۱۹۱۳ء)، تمدنِ ہند...... (مترجم، سید علی بلگرامی) آگرہ ص ۶۵۔۷۳

۹۔ پروفیسر سید نواب علی۔ (۱۹۶۳ء)، ...... معارج الدین۔ کراچی۔ مکتبہ افکار۔ ص ۱۵۰

۱۰۔ ڈاکٹر عبدالرشید۔ (۱۹۹۱ء)، ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ۔ کراچی۔ طاہر سینٹر۔ ص ۳۱

۱۱۔ ڈاکٹر تارا چند۔ (۱۹۶۴ء)، تمدنِ ہند پر اسلامی اثرات۔ (مترجم، محمد مسعود احمد) لاہور۔ مجلس ترقی ادب۔ ص ۱۱

۱۲۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔ (۱۹۶۶ء)، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں۔ معارف پریس، اعظم گڑھ۔ ص ۳۲

۱۳۔ سید محمد لطیف۔ (۱۹۹۵ء)، آگرہ: اکبر اور اس کا دربار۔ لاہور: تخلیقات۔ ص ۱۵۹

۱۴۔ المسدوسی، احمد عبداللہ (۱۹۵۸ء)، مذاہب عالم، کراچی: مکتبہ خدامِ ملت۔ ص ۱۲۹

۱۵۔ شیخ عبدالحق محدث دھلوی۔ (۱۹۹۹ء)، فقہ و تصوف۔ (مترجم: عبدالحکیم شرف قادری) لاہور: الممتاز پبلی کیشنز۔ ص ۱۹۹

۱۶۔ محمد بن احمد ابو ریحان البیرونی۔ (۱۹۴۲ء)، کتاب الہند (ج۔۱)، (مترجم: سید اصغر علی)۔ دہلی: انجمن ترقی اردو۔ ص ۳۴۰

۱۷۔ ابوالحسن بن حسین بن علی المسعودی۔ (۱۹۸۵ء)، مروج الذہب و معادن الجواہر المعروف بہ تاریخ مسعودی۔ (مترجم: پروفیسر کوکب شادانی)۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔ ص ۹۷

۱۸۔ ایضاً۔ تمدنِ ہند۔ ص ۱۳۷

۱۹۔ ایضاً۔ کتاب الہند (ج۔۲)، ص ۳۵۰

۲۰۔ عبدالرحمن ابن بطوطہ۔ (۱۹۶۱ء)، عجائب الاسفار۔ (مترجم: رئیس احمد جعفری)۔ کراچی: نفیس اکیڈمی۔ ص ۵۰۹۔۵۰۶

۲۱۔ ایضاً۔ معارج الدین۔ ص ۱۵۶

۲۲۔ ایضاً۔ مذاہب عالم۔ ص ۱۸۷

۲۳۔ ایضاً۔ کتاب الہند (ج۔۱)، ص ۱۷

۲۴۔ ایضاً۔ معارج الدین۔ ص ۱۵۷

۲۵۔ ایضاً۔ تمدنِ ہند (مقدمہ)، ص ۴۔۱۵

۲۶۔ ایضاً۔ کتاب الہند (ج۔۲)، ص ۳۵۴

۲۷۔ ایضاً۔ ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ۔ ص ۳۰

۲۸۔ ایضاً۔ تاریخ مسعودی۔ ص ۱۹۰

۲۹۔ ایضاً۔ کتاب الہند (ج۔۱)، ص ۱۷

۳۰۔ ایضاً۔ معارج الدین۔ ص ۱۷۸۔۱۷۶

۳۱۔ اردو انسائیکلو پیڈیا (دوسرا ایڈیشن)۔ (۱۹۶۸ء)، (ج۔۱)۔ لاہور: فیروز سنز۔ ص ۵۵۴

۳۲۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ (ج۔۷)، (۱۹۷۱ء)۔ لاہور: دانش گاہ پنجاب۔ ص ۶۰۴

۳۳۔ عمادالحسن آزاد فاروقی۔ (۱۹۹۰ء)، دنیا کے بڑے مذاہب۔ لاہور: مکتبہ تعمیر انسانیت، ص ۲۰۱

۳۴۔ ایضاً۔ مذاہب عالم۔ ص ۲۲۵

۳۵۔ ایضاً۔ ادیان و مذاہب کا تقابلی مطالعہ۔ ص ۱۲۰

۳۶۔ ہندو مذاہب کے احیا کے لیے کام کرنے والی تنظیم راشٹریہ سویم سیوک سنگھ (آر۔ایس۔ایس)

۱۹۲۰ء میں قائم کی گئی۔ اس وقت تنظیم جزوی طور پر مسولینی کی اٹلی میں جاری "براؤن شرٹ موومنٹ" سے متاثر تھی۔ آر ایس ایس عصر حاضر میں سیاسی جماعت بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کا اہم ترین حصہ ہے۔

۳۷۔ جنگ سنڈے میگزین، تاریخ ۲۱ر جولائی ۲۰۰۲ء بحوالہ فنانشل ٹائمز لندن کے ایڈورڈ لوئس کی حالیہ اشاعت زعفرانی انقلاب "THE SAFFRON REVOLUTION"۔ ص ۱۱

۳۸۔ دہلی یونی ورسٹی کے تاریخ کے پروفیسر ڈی این جھا نے اپنی کتاب "THE HOLY COW" میں اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ بھارتی مقدس ویدوں کے سنہرے دور ۱۵۰۰ ق م سے ۶۰۰ ق م میں گائے کے ذبیحے اور اس کا گوشت کھانے کا رواج اونچی ذات کے ہندوؤں میں عام تھا۔ جبکہ ہندوؤں کا کہنا ہے کہ بھارت میں گائے کا گوشت کھانے کا آغاز بارھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے اور اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزوں نے کیا تھا۔ پروفیسر جھا کی مذکورہ کتاب پر بھارتی عدالتوں نے پابندی لگوا کر اس کی تمام جلدیں ضائع کرادی ہیں۔

۳۹۔ راجکمار سنہا۔ (مئی ۱۹۶۱ء)، ہندوستان کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ۔ ماہنامہ دین و دنیا۔ دہلی۔ ص۔ ۲۷۔۲۹

۴۰۔ ISHWARI PARASHAD,(1964). A Short History of Muslim rule in India, Allahabad: The Indian press. p 244

۴۱۔ بنی پرشاد سکسینہ۔ (۱۹۸۸ء)، تاریخ شاہ جہاں۔ لاہور: پروگریسیو بکس۔ ص ۲۱۸

۴۲۔ V.D MAHAJAN.(1962), The Muslim Rule in India. New Delhi: S. Chand & Co., p 207

۴۳۔ Ibn-e-Hassan, (1958), Central structure of the Mughal Empire in Northern India, Lahore: Majlis Taraqqi Adab. p 310

۴۴۔ G. B. Melleson. (1903/1979), Rulers of India, Akbar and the Rise of Mughal Empire, Lahore: Islamic book Service. p 75

۴۵۔ R.C. Majumdar. (1974), The History and Culture of the Indian people of the Mughal Empire, Bombay: Bhartiya Vidya Bhavan. p 544

۴۶۔ Sri Ram Sharma. (1940), The Religious Policy of the Mughal Emperors, Bombay: Munshiram Manoharlal Publishers, p181.

۴۷۔ احمد محمود الساداتی۔ (س ن)۔ تاریخ المسلمین فی شبہ القاریہ الہندیہ و حضارتہم۔ القاہرہ: سکتہ الادب بالجمامیز۔ ص ۲: ۱۱۴
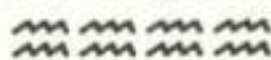
سامانِ بخشش کا علمی و ادبی تجزیہ

از: انوار محمد عظیم آبادی، عالم گنج، پٹنہ

"سامانِ بخشش" تاج دار اہلِ سنّت حضور مفتیِ اعظم ہند محمد مصطفیٰ رضا خاں نوری قدس سرہ العزیز کا مشہور مجموعۂ کلام ہے اور اس کا وہ مطبوعہ نسخہ اس وقت ہمارے سامنے ہے جو حضرتِ نوری کی حیات ظاہری میں ہی 'آل انڈیا اسلامک مشن' مدن پورہ بنارس کے زیر اہتمام شائع ہوا تھا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ۱۴۲ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب حمد و نعت اور منقبت کا نہایت ہی حسین گلدستہ ہے۔ اس کے آخری صفحات پر حضرت نوری کی چھ خوبصورت رباعیاں بھی درج ہیں جن میں طلب مغفرت کے مضمون کے ساتھ ساتھ کلام کے موضوع و مقصد اور اس کے وصف اصلی کی طرف نہایت ہی سادگی سے اشارہ کر دیا گیا ہے اور جو کچھ کہا گیا ہے وہ محض شاعرانہ تعلّی نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت ہے۔ رباعیاتِ نوری سے بلاشبہ ایک ولی کی کسر نفسی اور خوفِ الٰہی پر مبنی اس کی نفسیات کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔ اور پڑھنے والوں کو اپنے اپنے نفس و اعمال کے احتساب کی خاموش و پُر اثر دعوت دیتا چلا جاتا ہے۔

ہیئتی صنفِ سخن "رباعی" کے علاوہ اس مجموعہ کا بڑا حصہ بلکہ تمام تر حصہ اصطلاحاتِ شعر اور متعلقاتِ شعر کے اعتبار سے مختلف موضوعات اور ہیئتِ شاعری سے وابستگی رکھتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر حمد و نعت اور منقبت کے دوش بدوش ہیئتِ غزل، مسدس، مخمس اور مربع وغیرہ کے نمونے پیش کرتا ہے۔ "سامانِ بخشش" میں "ضربِ ھو" سے "اذکارِ توحید" تک کم و بیش بیس (۲۰) صفحات حمد یہ کلام کے لیے مخصوص ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ اس میں نفسِ مضمون کو عالی مرتبت شاعر نے کچھ ایسی فکری و فنی عظمتوں کے ساتھ سامنے لایا ہے کہ اس کی تھوڑی سی تفصیل بھی لکھی جائے تو ایک مبسوط کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ بلاشبہ حضرت نوری کی حمد یہ شاعری پر عرفان و تصوف کا خصوصی رنگ غالب ہے اور یہاں بہت ہی منفرد، دلوں کو چھو لینے والے حد درجہ سامعہ نواز غنائی آہنگ سے اس طرح کام لیا گیا ہے کہ الفاظ و محاورات کے استعمال میں سادگی کا وطیرہ آمد کی عجب شان کے ساتھ "سہل ممتنع" کی اعلیٰ مثالیں بھی "سطر بہ سطر" پیش کرتا چلا جاتا ہے۔

"سامانِ بخشش" میں جہاں تک نعت و سلام اور منقبت کی شاعری کا تعلق ہے، یہ بھی بہ ہمہ جہت گونا گوں خصوصیات اور فکری و فنی ملتزمات کی حامل نظر آتی ہے۔ حضرت نوری کے والد گرامی صاحبِ "حدائق بخشش" نے اپنے ایک شعر میں قرآن پاک سے نعت گوئی سیکھنے کی بات کہی تھی اور حضرت نوری نے اپنے ایک شعر میں بصورت نظریہ، قرآن کریم سے نعت گوئی کے سلسلہ میں، مضامین کے حدود و مقادیر کو سمجھنے کی بات یوں سامنے لا دی ہے کہ۔

بیانِ عیب دشمن نعت ہی ہے کہ قرآں میں بھی "تبت یدا" ہے!

حضرت نوریؔ کے کلام میں نہ صرف یہ کہ نعت گوئی اور زیارتِ نبی کے تعلق سے جابجا حسنِ آرزو کا اظہار ہوا ہے۔ ۲؎ بلکہ "اے نبیوں کے نبی اور اے رسولوں کے امام" والی نعت شریف کے ایک بند میں جس طرح حمد و نعت کی جلوہ گری کا نمونہ پیش کیا گیا ہے، وہ بھی قابلِ دید ہے۔ ۳؎ مزید برآں متعدد نعتیہ اشعار میں حضرت نوریؔ نے شفاعتِ کبریٰ، نور و سایہ اور عقیدۂ توسّل وغیرہ کے مضامین جس سادگی اور خوب صورتی کے ساتھ لائے ہیں وہ بھی حد درجہ لائقِ التفات ہے۔ ۴؎ حضرت نوریؔ کے نظریۂ نعت گوئی کا اشارہ ابھی آچکا ہے۔ چنانچہ اس کے زیرِ اثر ہم دیکھتے ہیں کہ "سامانِ بخشش" کی نعتیہ شاعری میں جابجا ایسے مضامین کی شمولیت ہوئی ہے جو ردِّ قادیانیت اور ردِّ دہریت سے تعلق رکھتے ہیں اور بدمذہب فرقوں کے احوال یا یوں کہا جائے کہ ان کے ظاہر و باطن کی تمام تصویریں پوری پڑھنے والوں کے سامنے لادیتے ہیں۔ ۵؎

مذکورہ مضامین کے علاوہ "سامانِ بخشش" کے صفحات پر ایسے اشعار بھی دیکھے جاسکتے ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی اور نصیحت و موعظت کا مضمون باندھا گیا ہے۔

بہارِ دنیا ہے فانی، نظر نہ کر اس پر ہے کوئی دم کی یہ ساری بہار آنکھوں میں ۶؎
اچھے جو کام کرنے ہیں، کرلو جان اپنی نہیں پرائی ہے ۷؎

لطف بالائے لطف یہ ہے کہ اس مجموعہ کے بعض اشعار ایسے ہیں جو اپنے بیان اور اندازِ بیان کے لحاظ سے صاف صاف بتادیتے ہیں کہ وہ کسی بڑے ولی صفت عالمِ دین اور صوفی شاعر کے قلم سے صفحۂ قرطاس پر آئے ہیں۔

نفسِ بدکار نے دل پر یہ قیامت توڑی عملِ نیک کیا بھی تو چھپانے نہ دیا ۸؎

حضرت نوریؔ کی شاعری میں نہ تو عصری حسیت کے ذیل میں آنے والے مشاہداتی و تجرباتی بیانات کی کوئی کمی ہے اور نہ ہی ایسے مضامین اور بیانات کی کوئی کمی جو منظر نگاری اور تصویر کشی کے ذیل میں آتے ہیں۔ حضرت نوریؔ نے کہیں یہ کہتے ہوئے اہلِ زمانہ کا کردار سامنے لادیا ہے کہ

دنیا ہے اور اپنا مطلب، بے غرض مطلب کوئی آشنا ملتا نہیں، ناآشنا ملتا نہیں ۹؎

اور کہیں یہ کہتے ہوئے اپنے دور کے نام نہاد علما و مشائخ کی عملی تصویر ہمارے سامنے رکھ دی ہے کہ

اہلے گہلے مشائخ آج کل ہر ہر گلی بے ہمہ و باہمہ مرد خدا ملتا نہیں ۱۰؎

بلاشبہ "سامانِ بخشش" میں بعض مقامات پر حضرت نوریؔ نے میدانِ حشر کی نفسانفسی کے پردے میں جس طرح آج کے دور کی منظر کشی کی ہے اور شفاعتِ رسول کے مضمون کو جس انداز سے ایک کُل کی تصویر کے روپ میں سامنے لادیا ہے وہ شعر و ادب کے کسی بھی باذوق قاری سے پوری طرح دادِ تحسین حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔

نعتیہ شاعری میں رحمتِ رسول کا مضمون لانا تو عام سی بات ہے، البتہ "سامانِ بخشش" کے بزرگ فن کار کا یہ بڑا امتیاز ہے کہ اس کے قلم سے اکثر نعتیہ اشعار میں غیروں پر رحمتِ رسول کا مضمون باندھا گیا ہے اور اس قسم کے مضمون کو متحرک اور زندہ تصویر کے روپ میں حوالۂ قرطاس کیا گیا ہے۔ ۱۱ اگر ایک طرف حضرت نوری کے کلام میں ایسے تلمیحی اشعار کی کمی نہیں جو معجزاتِ نبی کے بیان سے آراستہ ہیں۔ ۱۲ تو دوسری طرف یقیناً ان کے پیشِ نظر مجموعۂ کلام میں ایسے اشعار بھی ہماری توقع سے کہیں زیادہ ملتے ہیں جن میں نوع بہ نوع آفاقی صداقتوں کو سہلِ ممتنع کی ایسی شان کے ساتھ نظم کردیا گیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو انہیں "ارسالِ مثل" یعنی کہاوتوں کے برجستہ استعمال کا بہترین نمونہ بھی کہہ سکتا ہے۔

بے نوا کو بے صدا ملتا ہے اس سرکار سے　　　دودھ بھی بیٹے کو ماں سے بے صدا ملتا نہیں ۱۳

کب مٹانے سے کسی کے خطِ تقدیر مٹے　　　ہو کے رہتا ہے جو قسمت کا لکھا ہوتا ہے ۱۴

حضرت نوری نوراللہ مرقدہٗ کے کلام میں بیان مناقب کے دوران بھی، بعض متذکرہ خصائص کے دوش بدوش، دیگر نوع بہ نوع خوبیاں قارئین کو بلاتکلف اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہیں۔ یہاں نہ صرف یہ کہ "خودی کو مٹادے' خدا سے ملادے" جیسے بے ساختہ دعائیہ مصرعے ملتے ہیں۔ ۱۵ بلکہ بعض اشعار اور مصرعوں میں اولیائے کرام کے واقعات اور احوال و اقوال کی طرف اشارہ بھی بہت ہی خاص تلمیحی لطف دے جاتا ہے۔ ۱۶ پھر حضرت نوری کی شاعری میں بعض مقامات پر جس طرح کچھ مشہور مصرعوں سے فن کارانہ استفادہ کی مثال ملتی ہے۔ ۱۷ اور جس طرح بعض اشعار میں "سیاقتِ عدد" کے ساتھ حروفِ تہجی اور اعداد ابجدی کی طرف معنویت و لطافت سے بھرپور عالمانہ اشارے اپنی بہاریں دکھاتے ہیں وہ بھی یقیناً اہلِ ذوق وفہم کے لیے کسی کم یاب تحفہ سے کم نہیں۔

زن، زمین و زور و زر کے ہیں گاہک ہر کہیں　　　دل سے جو ہو طالبِ ذکرِ خدا، ملتا نہیں

چار زا اک ذال کے بدلے میں لیں، چوکس رہے　　　یہ نہ سمجھے یہ اکائی سیکڑا ملتا نہیں ۱۸

موضوعاتی حسن و تقدس اور تنوعات کے دوش بدوش حضرت نوری کی شاعری میں سادگی' معنوی پُرکاری' زورِ بیان' اثباتِ مضمون و دعویٰ۔ ۱۹ جیسے اوصاف بھی جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ مزید برآں "سامانِ بخشش" کے اشعار میں حضرت احمد رضا کی لفظیات شاعری سے استفادہ کا ہنر۔ ۲۰ زیورات کے تلازمے سے کام لینے کی فن کاری۔ ۲۱ گیتوں کی لفظیات' ہندی الفاظ کے برجستہ استعمال ۲۲، نیز سوالیہ انداز کی معنویت' بیان کی جامعیت اور خیال آفرینی کی حسین مثالیں بھی بکثرت موجود ہیں۔ ۲۳ اتنا ہی نہیں بلکہ بعض اشعار میں حضرت نوری کے یہاں "خود گفتہ تضمین" کی کیفیت بھی عجیب لطف دے جاتی ہے۔ ۲۴ "سامانِ بخشش" کے عالی مرتبت شاعر کا کلام پڑھتے ہوئے یا نقل کرتے ہوئے جس طرح علاماتِ قرأت کا خاص لحاظ رکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ حضرت نوری کی شاعری "نزاکتِ زبان" کی

شاعری ہے اور اس اعتبار سے وہ بلاشبہہ "لہجے کے شاعر" کہے جانے کا استحقاق رکھتے ہیں۔ ۳۵

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی بھی شعری وفنی شاہ کار کا مطالعہ کرنے والے مختلف طبائع ومیلان اور علمی وادبی ذوق کے حامل ہوتے اور ہوسکتے ہیں۔ اس طرح ممکن ہے کہ کسی پڑھنے والے کو کلامِ نوریؔ کی سادگی میں کہیں کچھ "سپاٹ پن" کا احساس ہو یا کسی مقام پر جار ومجرور کی فارسی ترکیب کا استعمال ۳۶ تھوڑی دیر کے لیے کچھ کھٹک پیدا کردے یا پھر ایسا ہو کہ اظہارِ عقاید میں شاعر کی صاف گوئی پسند نہ آئے اور مقصدیت کے اظہار میں "فن کا پردہ" سرکتا ہوا محسوس ہو لیکن فی الواقعہ ان باتوں سے حضرت نوریؔ کی شاعری کے بلند وبالا مرتبہ پر چنداں فرق نہیں آتا۔ سب سے بڑی بات تو یہی ہے کہ اس قسم کے تنقیدی وتجزیاتی نکات "اسقامِ شرئی" سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے اور پھر یہ کہ اصول وبنیادی اسقامِ شاعری یا تسامحاتِ فن کے ذیل میں بھی نہیں آسکتے۔ رہا معاملہ بعض طبائع کی پسند اور احساس کا، تو ظاہری بات ہے کہ جب بڑے بڑے عالمی شہرت کے حامل شعری شاہ کار، تمام اہلِ نظر قارئین کے تجزیاتی احساسات کا یکساں مداوا نہیں کرسکتے تو پھر ان باتوں سے کسی ایسے مجموعۂ کلام کی اہمیت وافادیت اور ادبی شان وشوکت پر کیا فرق آسکتا ہے۔ جس کے موضوعات کا تقدس، جس کے مقاصد کا اخلاص اور جس کی فن کاری کا نہ صرف یہ کہ شرئی کمزوریوں سے منزہ ہونا روزِ روشن کی طرح عیاں ہو بلکہ اس میں صناعاتِ سخن کے اعتبار سے حُسنِ تراکیب، نوع بنوع تجنیسات، ترادفات ومناسبات، تلمیحات، ترصیع اصوات، محاورات وامثال کی حسنِ بندش، تنسیقات وتعلیقات، نوع بہ نوع سیاقات، ردّ صدر وابتدا، اقتباسات واشتقاقات، توامی اضافات، کلامِ ذولسان، حُسنِ مبالغت، تضاد وتطابق، صنعتِ مہملہ وفوقانیہ وتحتانیہ نیز ارسال مثل اور سہل ممتنع کے صدہا نمونے اس طرح فنی نزاکتوں کے ساتھ اپنے جلوے دکھا رہے ہوں کہ ان کی طرف رمزی اشارات کے لیے بھی دوچار نہیں بلکہ دس بیس صفحات مطلوب ہوں۔ حقیقت یہی ہے کہ "سامانِ بخشش" میں صنائع وبدائع کا ہنرمندانہ استعمال بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے اور اس پر اظہار کے لیے فرصت کے مناسب لمحات کی تلاش سے مفر نہیں۔

حواشی واشارات

۱۔ سامانِ بخشش، ص ۱۳۰
۲۔ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۳۶ وص ۱۲۰
۳۔ سامانِ بخشش، ص ۸۲
۴۔ متعلقہ اشعار کے لیے بالترتیب: سامانِ بخشش، ص ۹۵، ص ۳۶ وص ۹۰
۵۔ متعلقہ اشعار کے لیے بالترتیب: سامانِ بخشش، ص ۱۱۰، ص ۱۲۹، ص ۹۰ وص ۱۲۷
۶ تا ۸۔ سامانِ بخشش، بالترتیب: ص ۹۸، ص ۱۲۴ وص ۵۸
۹ تا ۱۰۔ سامانِ بخشش ص ۸۹، مزید متعلقہ اشعار کے لیے ص ۶۱ وص ۱۳۷

۱۱ متعلقہ اشعار کے لیے بالترتیب: سامانِ بخشش، ص ۱۳۵، ص ۱۱۶، ص ۱۱۷ و ص ۱۰۵

۱۲ متعلقہ اشعار کے لیے بالترتیب: سامانِ بخشش، ص ۶۲، ص ۶۳ و ص ۷۵

۱۳ و ۱۴ سامانِ بخشش ص ۹۱ و ص ۱۱۵، مزید متعلقہ اشعار کے لیے: ص ۶۳، ص ۱۲۷، ص ۱۲۹ و ص ۱۳۶

۱۵ سامانِ بخشش ص ۸۳

۱۶ متعلقہ اشعار اور مصرعوں کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۸۷، ص ۸۸ و ص ۸۵

۱۷ متعلقہ مصرعوں کے لیے: سامانِ بخشش ص ۹۰

۱۸ سامانِ بخشش ص ۹۱

۱۹ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۴۵، ص ۴۶، ص ۶۳ و ص ۷۹

۲۰ و ۲۱ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۵۷ و ص ۶۴

۲۲ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۶۷، ص ۴۹ و ص ۵۳

۲۳ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۷۹ و ص ۶۳

۲۴ تا ۲۶ متعلقہ اشعار کے لیے: سامانِ بخشش، ص ۵۳، ص ۱۱۳ و ص ۱۰۶

□□□□□□

بقیہ: **رضا شناسی کا عمل**

﴿۶﴾ مسلک کی حقانیت اور امام احمد رضا کے موضوع پر شائع کتابوں کی تعریب ہو اور ممالکِ عربیہ میں عام ہو۔

﴿۷﴾ خانقاہوں سے مراسم و تعلقات کا احیا ہو، انہیں اپنے مشن میں شریک کیا جائے اور امام رضا کے ساتھ اُن مشائخ کا بھی تذکرہ کیا جائے جن کی روحانی اور علمی قوتوں نے تبلیغ و اصلاح کا کام کیا ہے۔

﴿۸﴾ کوشش کر کے چنندہ عالمی دانش گاہوں میں امام احمد رضا پر سیمنار کرائے جائیں، ان کی کتابیں اور اس سے متعلق سی ڈی (CD) تقسیم کی جائے۔

﴿۹﴾ اب تک رضویات پر سینکڑوں کتابیں اور ہزاروں مقالات لکھے جا چکے ہیں۔ ان میں کچھ کتابیں واقعی ضرورت کی تکمیل کرتی ہیں اور کچھ محض مصنف بننے کے شوق میں لکھی گئی ہیں جن میں مکررات اور مبالغہ آرائی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا معیار متعین کیا جائے۔

+++++

میرے رضا کا پاکستان (قسط ۵)

از: محمد زبیر قادری

گذشتہ قسط میں احقر نے پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا تھا وہ احقر کی ذاتی رائے نہیں بلکہ اہل پاکستان کی رائے ہے۔ چونکہ طاہر القادری پاکستانی ہیں اس لیے 'وہ' ہم سے بہتر طور پر انہیں جانتے ہیں۔...... آج میڈیا کی ترقی کا فایدہ اُٹھا کر کوئی بھی شخص بین الاقوامی شہرت حاصل کرسکتا ہے۔ ان دنوں کیو ٹی وی پر پروفیسر طاہر القادری کے بیانات تقریباً روزانہ دکھائے جارہے ہیں۔ کیو ٹی وی کو چونکہ سُنّیوں کا چینل سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے اس پر نظر آنے والی شخصیت کو عوام سُنّی ہی سمجھتی ہے۔ ویسے بھی طاہر القادری نام میں "قادری" کا لاحقہ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے کافی ہے۔

طاہر القادری کی حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے سیاسی شخصیتوں کے کاندھے پر پیر رکھ کر اپنا قد اونچا کیا، ملّت میں اپنا مقام بنانے کے لیے سیاسی حربوں کا استعمال کیا۔ دوسری طرف انھوں نے اُمّت کے کئی اجماعی مسائل میں علمائے عصر سے اختلاف کیا۔ "منہاج القرآن" کے نام سے تحریک بنائی لیکن طاغوتی منہاج اپنایا۔ بدمذہبوں سے اتحاد کیا اور اپنوں میں انتشار پیدا کیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ طاہر القادری ایک اچھے مقرر ہیں اور وہ لوگوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنالی ہے اور ایک فرقے کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کے سُنّی حلقوں میں کوئی ان کا نام لیوا نہیں۔ سُنّی مکتبے ان کی کتب رکھنا پسند نہیں کرتے۔

بروز جمعرات ۲۲ر ستمبر ۲۰۰۵ء لاہور میں مکتبۂ نبویہ پر جب ہم (راقم اور برادر عارف جامی) پہنچے تو دیکھا کہ حضرت پیرزادہ اقبال فاروقی صاحب مع احباب کے دکان میں تشریف فرما ہمارے منتظر ہیں۔ وہیں بھائی خلیل رانا صاحب احقر کا بے صبری سے انتظار کررہے تھے جو صرف احقر سے ملاقات کی غرض سے کافی طویل سفر کرکے لاہور آئے اور ہمیں لینے ریلوے اسٹیشن بھی پہنچے تھے مگر ٹرین کی تاخیر نے انھیں مایوس لوٹایا۔ تمام احباب نے پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ مصافحہ اور معانقہ کے بعد آپس میں حال احوال دریافت کیا گیا۔

پیرزادہ فاروقی صاحب کی تحریر کی طرح اُن کی زبان میں بھی چاشنی ہے۔ جب وہ پنجابی لب و لہجے میں اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو دل کرتا ہے کہ وہ کہتے رہیں ہم سنتے رہیں۔ ہم نے کافی دیر تک ان کے شیریں لب و لہجے میں پاکستان اور عالم اسلام کے احوال سماعت کیے۔ پھر کچھ چائے ناشتے کے بعد ہم نے اپنے سامان میں سے اُن کے لیے لائی گئی کتب کے تحفے اور خطوط پیش کیے۔ پھر اپنا سامان وہاں رکھا اور مسلم کتابوی کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہاں خلیل رانا صاحب نے احقر کو کچھ کتابیں تحفتاً پیش کیں جو وہ احقر

کی نذر کے لیے ساتھ لائے تھے۔

داتا دربار کے پہلو میں واقع مسلم کتابوی نامی مکتبہ جناب فرخ صاحب کا ہے جو فی الوقت امریکہ میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنے جانے کے بعد مکتبہ کی ذمہ داری سید منیر رضا صاحب قادری کو دے گئے جو کہ دعوتِ اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لاہور میں سابقہ اسفار کی بنا پر احقر کی اُن سے واقفیت ہے۔ اُن کے مکتبہ پر سب سے پہلے تو میں نے اپنی مطلوبہ کتابوں کی لسٹ اُنھیں دی جو احقر اور کچھ دیگر احباب کو درکار تھیں، اور اُن سے تمام کتابیں نکالنے کا مطالبہ کیا۔ پھر احقر بھی الماریوں میں رکھی ہوئی کتب کو دیکھنے لگا اور اُن میں سے اپنے مزاج و مذاق کی کتابیں نکالنے لگا۔

مسلم کتابوی پر میری ملاقات ایک نوجوان ہارون رضوی سے ہوئی۔ جب اُس نے اپنا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ یہی وہ صاحب ہیں جنھوں نے میرے پاس پیر کرم شاہ ازہری کے ردّ میں ایک طویل خط ای میل سے بھیجا تھا۔ ہوا یوں کہ ہمارے کسی رسالے اور ایک کتاب "حسام الحرمین کے سو سال" میں پیر کرم شاہ ازہری صاحب کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ شائع ہوگیا۔ اور اُن کا نام بھی ادب و احترام سے لکھا گیا تھا۔ اس پر ہارون رضوی نے پیر صاحب کی تحریروں کو بنیاد بنا کر اُن کا ردّ لکھ بھیجا۔ ہم نے وہ خلیل رانا صاحب کو بھیج دیا کہ یہ معاملہ آپ کے ملک کا ہے اس لیے ہم نہیں جانتے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ خلیل صاحب نے اپنے دوست ڈاکٹر الطاف حسین سعیدی صاحب سے ہارون رضوی کی تردید میں ایک مضمون "پیر کرم شاہ کا دفاع" لکھ بھیجا جو ہم نے افکارِ رضا شمارہ   میں شائع کردیا گیا۔

محمد ہارون رضا برکاتی رضوی ایک نوجوان طالب علم ہے۔ عمر مشکل سے ۲۰۔۲۲ سال ہوگی مگر اس نوجوان کا مطالعہ کافی وسیع ہے۔ مَیں نے دینی طالب علموں میں بہت کم ایسے افراد دیکھے ہیں جن کا مقصد خالص دینی تعلیم کا حصول ہو۔ ورنہ اکثریت اُن طلبہ کی ہوتی ہے جن کے والدین مدارس میں اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ پلنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ اسی لیے اُن میں دینی تعلیم کے حصول کی طرف اس قدر رغبت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ آج مدارس سے فارغ طلبا کی اکثریت نیم ملاؤں کی طرح ہوگئی ہے۔

لیکن ہارون رضوی کئی کتب فتاوی، کتب تفاسیر اور کتب سیرت کا سیر حاصل مطالعہ کرچکے ہیں۔ ان سے گفتگو کے دوران اُن کے استحضارِ علم کا پتہ چلا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ پہلے اپنے کاموں سے فارغ ہولیں پھر مَیں آپ کو پیر کرم شاہ صاحب کے بارے میں حقائق بتلاؤں گا۔ ان شاء اللہ آپ اُن کی کتب دیکھنے کے بعد یقیناً اپنی رائے میں تبدیلی لائیں گے۔

رات میں فرصت ملنے پر جناب ہارون صاحب نے مجھے پیر صاحب کی تفسیر اور دیگر کتب کے حوالوں سے بتایا کہ:

پیر کرم شاہ صاحب کے بارے میں عرض ہے کہ پیر صاحب کے بہت سے نظریات جمہور اہلسنّت کے خلاف ہیں۔ مثلاً وہ اہلسنّت حنفی بریلوی اور فرقۂ دیوبندیہ دونوں کو اہلسنّت میں سے گردانتے ہیں۔ اور ان کے درمیان اختلافات کو فروعی بتلاتے ہیں۔ نیز اپنی تفسیر ضیاء القرآن کے جلد اوّل ص ۳۵ میں قاسم نانوتوی کو پاکانِ اُمت میں شمار کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اپنی تفسیر ضیاء القرآن میں وہابیہ دیابنہ کے کثیر حوالہ جات نقل فرماتے ہیں۔ اگر مسلکِ اہلسنّت کی تائید میں ایسا کرتے تو کچھ حرج نہ تھا مگر وہ اپنی بات کو مضبوط کرنے کے لیے اکثر تفہیم القرآن، تفسیر ماجدی، تفسیر عثمانی، معارف القرآن، بیان القرآن وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں۔

طلاقِ ثلاثہ یعنی بیک وقت تین طلاقوں کے تین ہونے کے منکر ہیں اور بیک وقت تین طلاقوں کے ایک ہونے کے قائل ہیں۔ جو کہ ابن تیمیہ اور وہابیہ کا مذہب ہے۔ اس موضوع پر موصوف کی ایک پوری کتاب ''دعوتِ فکر ونظر'' ہے جو پاکستان میں وہابیہ کے نعمانی کتب خانہ، اردو بازار، لاہور نے شائع کی ہے اور غالباً بھارت میں بھی کسی غیر مقلد مکتبے نے شائع کی ہے۔ نیز اب کرم شاہ کے حالات پر چھپنے والی کتاب ''جمالِ کرم'' کی جلد اوّل میں بھی اس بات کا اقرار کیا گیا ہے پیر صاحب موصوف تحذیر الناس کے حامی تھے اور بیک وقت تین طلاقوں پر وہابیہ والا مؤقف رکھتے تھے۔ کرم شاہ صاحب کی دونوں کتابیں ''دعوتِ فکر ونظر'' اور ''تحذیر الناس میری نظر میں'' اس کتاب ''جمالِ کرم'' میں شامل ہیں۔

اب آپ فرمایئے کہ یہ کونسی تحریک فکر رضا ہے کہ امام احمد رضا تو تحذیر الناس کے بارے میں فرمائیں کہ یہ کفر ہے اور جو اس کے مصنف کے کفر یا عذاب میں شک کرے وہ بھی کافر۔ مگر آپ کے نزدیک وہ شخصیت جو قاسم نانوتوی کے کفر میں شک ہی نہیں کررہی بلکہ اُسے مسلمان قرار دے رہی ہے رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ امام احمد رضا بیک وقت تین طلاقوں کو ایک قرار دینے والے کو گمراہ قرار دیں اور آپ رحمۃ اللہ علیہ۔ فیاللعجب۔

پھر آپ نے بڑے طمطراق سے اس شمارہ میں ڈاکٹر الطاف سعیدی کے مضمون ''حسام الحرمین کے سو سال'' چھاپنے کا اعلان فرمایا جس میں انہوں نے بغیر دلیل وحوالہ کرم شاہ کی حمایت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن سے پوچھیں کہ اگر پیر صاحب اپنی عبارتوں پر نادم تھے تو وہ عبارتیں کتابوں سے نکالی کیوں نہیں؟ راقم نے کرم شاہ پر دو دفعہ رجسٹری خطوط بھیج کر اتمامِ حجت کی۔ مولانا سید بادشاہ تبسم بخاری آف اٹک نے کرم شاہ کے مرنے سے ۸، ۷ ماہ قبل اُسے سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہ سمجھا اور کہنے لگا کہ آپ حضرات سے جو ہوسکتا ہے آپ کرلیں میں کسی مسلمان (نانوتوی وغیرہ) کو کافر نہیں کہتا۔ پھر حضرت علامہ سید بادشاہ تبسم بخاری صاحب نے ماہنامہ کنزالایمان لاہور کے ختمِ نبوت نمبر ۱۹۹۷ء ستمبر میں ایک مبسوط مضمون ''پیر

کرم شاہ بھیروی کی صلح کلیت کا انجام" کے نام سے تحریر فرمایا جو ۶۴ صفحات پر مشتمل بہترین تحقیقی مضمون تھا۔ مگر پیر صاحب اس کا جواب دیئے بغیر ہی آنجہانی ہو گئے۔ حالانکہ یہ مضمون کرم شاہ صاحب کو بذریعہ رجسٹری ارسال کیا گیا تھا۔ نیز لاہور کے ہی ایک معروف عالم مفتی ڈاکٹر محمود احمد ساقی صاحب نے پیر کرم شاہ کے مرنے سے چند ماہ قبل دربار مارکیٹ میں کھڑے ہو کر عرض کیا کہ پیر صاحب! یہ آپ نے کیا گند ڈال دیا ہے؟ (تحذیر الناس اور طلاق ثلاثہ پر وہابی مؤقف کی حمایت کا) تو پیر صاحب نے فرمایا میں نے گند ڈال دیا ہے آپ میرے مرنے کے بعد اِسے صاف کر دینا۔

ڈاکٹر الطاف سعیدی صاحب کے پیر بھائی جناب مفتی عبدالمجید صاحب سعیدی اپنی کتاب "احمد البیان فی رضاءِ کنزالایمان" میں ص ۲۴۱ میں پیر کرم شاہ کو اعلیٰ حضرت رضی اللہ عنہ کا بڑا باغی اور مــــن شک فی کفرہ وعذابہ فقد کفر میں شامل بتلاتے ہیں۔ اس قدر اتمامِ حجت کے بعد میرا نہیں خیال کہ ڈاکٹر الطاف سعیدی صاحب کا لکھنا کہ پیر کرم شاہ صاحب اپنے کیے پر نادم تھے صحیح ہے۔ اور اب کرم شاہ کے حالات پر چھپنے والی کتاب "جمالِ کرم" نے تو صورت حال اور بھی واضح کر دی ہے۔...... اس خط کے ساتھ ہم نے ایک استفتاء کرم شاہ صاحب کے نظریات کے متعلق مرتب کیا تھا۔ وہ بھی حاضر خدمت ہے۔ ضرور بالضرور مطالعہ فرمائیں۔...... کرم شاہ صاحب کی حمایت اور فکرِ رضا دو متضاد چیزیں ہیں اور آپ ماشاء اللہ صاحب علم ہیں خوب جانتے ہیں کہ اجتماع ضدین محال ہے۔

کرم شاہ کے نظریات پر ہم نے دنیا کے تمام اہم سُنّی دارالافتاء سے رابطے کر رکھے ہیں۔ بھارت میں بھی مرکزی دارالافتا بریلی شریف، جامعہ منظر اسلام بریلی شریف، جامعہ اشرفیہ مبارکپور، امجدی دارالافتا، دامعہ فیض الرسول براؤن شریف وغیرہ سے مسلسل رابطہ ہے۔ حضرت جانشین ریحانِ ملّت علامہ سبحان رضا خان سبحانی مدظلہ العالی کی لاہور آمد پر ہم نے تمام دستاویزات اور کتب مع استفتا ان کے حوالے کی ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ ہاشمی میاں صاحب کی خدمت میں بھی معاملہ عرض کیا ہے۔ پاکستان کے کئی مفتیانِ کرام سے بھی رابطے کیے ہیں۔ سب ہی ان عبارتوں کو غلط کہتے ہیں۔ کچھ علما نے ان عبارتوں پر فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔ کچھ کی طرف سے جواب کا انتظار ہے۔ (اطلاع ملی ہے کہ حال ۲۰۰۷ء ہی میں پیر کرم شاہ صاحب کے نظریات کے ردّ میں ایک کتاب شائع ہوئی ہے، تفصیل کا علم نہیں)

اس دوران عارف جامی صاحب جو میری مصروفیات سے بور ہو رہے تھے وہ مسلم کتابوی سے نکل کر کسی اور طرف چلے گئے۔ جب تمام ہی مکتبہ سے مَیں اپنے مطلب کی اہم کتابیں نکال چکا تو علم کا اگلا خزانہ دیکھنے کے لیے آگے روانہ ہوا۔ اتنے میں عارف بھائی نے آواز دیکر ایک مکتبہ پر بلوا لیا۔ اور وہاں احقر کی ملاقات محمد عثمان صاحب رضوی سے کروائی۔ (باقی آئندہ...... ان شاء اللہ)

رضا نامے

٥ محمد توفیق احمد نعیمی، بانی و ناظم اعلیٰ مدرسہ عالیہ نعمانیہ، شیش گڑھ، بریلی شریف

آپ کے ''افکار رضا'' (مولیٰ تعالیٰ سلامت رکھے) کے شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۷ء میں فقیر کی کتاب ''اعلیٰ حضرت پر کتابیں'' شائع ہوئی۔ جزاک اللہ خیر الجزاء۔ اس میں صفحہ ۶۱ پر مسطور ہے کہ حجۃ الاسلام مولانا حامد رضا خاں نے ''القول الازھر'' رسالہ مولانا انوار اللہ حیدرآبادی کے جواب میں ''اجلی انوار الرضا (۱۳۳۴ھ) کتاب تحریر فرمائی۔ ہمارے اس بیان پر (شمارۂ اپریل تا جون ۲۰۰۷ء) میں صفحہ ۱۰۸ پر جناب شاہ محمد فصیح الدین نظامی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام امام محمد انوار فاروقی نوراللہ مرقدہٗ نے اس نام کا کوئی رسالہ تصنیف نہیں فرمایا۔ آگے لکھتے ہیں ''یہ ضرور ہے کہ اذانِ ثانی کے مسئلہ پر امام محمد انوار اللہ فاروقی نوراللہ مرقدہٗ و اعلیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مابین انتہائی سنجیدہ علمی مراسلت ہوئی (ہے)۔ جناب شاہ صاحب سے مخلصانہ گزارش ہے کہ جب آپ کو اتنا تسلیم ہے تو دو قدم آگے بڑھکر یہ بھی پتا لگائیں کہ اس نام سے ان کا کوئی مطبوعہ و غیر مطبوعہ رسالہ ہے کہ نہیں؟ آخر انھوں نے اپنے ان مراسلات کو کس نام سے جمع کیا؟ شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس نام کا رسالہ علامہ مولانا معین الدین اجمیری نے (۱۳۶۹ھ) میں تحریر فرمایا تھا۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ ایک نام کے کئی کئی رسالے ہوتے ہیں اور یہ بھی سوچنا چاہیے کہ مولانا اجمیری نے جو رسالہ لکھا ہے وہ ۱۳۶۹ھ کی تصنیف ہے اور اجلی انوار الرضا (۱۳۳۴ھ) کی تصنیف ہے۔ آخر ۳۵ برس بعد جو رسالہ وجود میں آیا اس کا رد پہلے کیسے کر دیا؟ بلکہ اس وقت تک حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ بقید حیات بھی نہیں رہے تھے کیونکہ ان کا سالِ وصال ۱۳۶۲ھ ہے۔

بطور معلومات عرض ہے کہ ''تذکرۂ جمیل'' سوانح حجۃ الاسلام مصنفہ مولانا ابراہیم خوشتر میں اجلی انوار الرضا کا جو تعارف اور اس کے صفحۂ اوّل کا جو عکس پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہی ثابت ہے کہ مولانا مولوی انوار اللہ خاں صاحب صدر الصدور صوبجات دکن کے رسالہ ''القول الازھر'' کی مخصوص تراش کے ردّ بلیغ میں ''اجلی انوار الرضا'' لکھا گیا۔ شیخ الاسلام کے نام کی رعایت نام کتاب سے بھی ظاہر ہے۔ صفحہ اوّل کا اندراج من و عن حاضر ہے۔...... اجلی انوار الرضا ۱۳۳۴ھ از تصانیف جناب مولانا مولوی مفتی حامد رضا خاں صاحب قدس سرہ جس میں گرامی جناب مولوی انوار اللہ خاں صاحب صدر الصدور صوبجات دکن کے رسالہ ''القول الازھر'' کی مخصوصہ تراش کا ردِ بلیغ ہے۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنّت مجددۃ المائۃ الحاضرہ...... کا مفاوضۂ عالیہ بطلب مناظرہ صاحب ممدوح کے نام اِمضاء فرمانا اور اُدھر مہر سکوت لگ جانا۔ مہینوں تقاضوں پر آواز تک نہ آنا ...... نوری کتب خانہ، بازار داتا صاحب، لاہور۔ گلزار عالم پریس لاہور...... (زیراکس بھی ہمراہ ہے)۔ اس وقت اس سے زائد تفصیل مشکل ہے۔

دوسرے نمبر پر فقیر مولانا محمد صادق رضا مصباحی کو نذرانہ سلام و محبت پیش کرتا ہے کہ انھوں نے اپنے

مکتوب میں دو الفاظ کے استعمال پر اعتراض دائر کرنے کے ساتھ ساتھ فقیر کی مذکورہ کتاب ''اعلیٰ حضرت پر کتابیں'' کو خوب خوب سراہا ہے بلکہ اپنے گمان میں شمارہ کی جان قرار دیا ہے۔ جزاہ اللہ خیرالجزاء

تیسرے نمبر پر افکار رضا کے مدیر محمد زبیر قادری صاحب سے مخاطب ہوں کہ خدارا آپ اپنے رسالہ کو بند نہ کریں اس سے اہل سُنّت کو عظیم فایدہ ہورہا ہے۔ آج آپ کا رسالہ پوری دنیا میں جانا پہچانا جاتا ہے۔ اس کے لیے آپ نے بڑی کوششیں کی ہیں۔ یہ سعادت ہر ایک کو میسر نہیں آتی۔ اس بام عروج پر لانے کے بعد آپ نے یہ فیصلہ کیسے کرلیا کہ افکار رضا کا پچاسواں شمارہ آخری شمارہ ہوگا، اس کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ واللہ یہ فیصلہ سُن کر فقیر کو سخت دھچکا سا لگا۔ مَیں ہی کیا بلکہ سارے قارئین ہی اسی حالت سے دوچار ہوں گے۔ فقیر پھر گزارش کرتا ہے کہ محبّا! کرم فرما! خدارا خدارا رسالہ ہرگز بند نہ فرمائیں۔ ہمارے لائق کوئی کام ہو ضرور بیان فرمائیں۔

○ **محمد صادق رضا مصباحی**، شعبۂ تصنیف وتالیف، المجمع الاسلامی، ملت نگر، مبارک پور

بار بار کی شکوہ سنجیاں نہ ہی ہمیں اچھی لگتی ہیں اور نہ ہی مخاطب ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہے مگر کچھ شکوہ گزاریاں اس طرح کی ہوتی ہیں جو ''خیال خاطر احباب'' کی بالکل پرواہ نہیں کرتیں اور ان سے بعض آبگینوں کو ٹھیس لگ ہی جاتی ہے۔ برسر مطلب افکار رضا کے تازہ شمارے اپریل تا جون ۲۰۰۷ء کا جب ہم تنقیدی جائزہ لینے بیٹھے تو ہمارا احساس بھی اس صورتِ حال کا لمس کیے بغیر نہ رہ سکا اور وہی پرانی گلہ مندی مجسم سوال بن کر سامنے آ کھڑی ہوئی کہ سرورق پر روزنامہ ''خلافت'' ص ۴ سے ماخوذ مولانا محمد علی جوہر کا تحریر کردہ جو اقتباس دیا گیا ہے وہاں تاریخ وسنہ کا اندراج کیوں نہیں دیا گیا؟ یہ حوالہ اتنا اہم تھا کہ اس کو بطور خاص مکمل کیا جاتا۔ ہماری اس کج مج آرائی سے یقین ہے کہ زبیر قادری صاحب کو سنجیدگی سے غور کرنے کا موقع ملے گا اور ضرور اس کا معقول تدارک کریں گے۔

جناب لئیق انصاری صاحب کی نعتِ رسول اور حمد باری تعالیٰ کے شعری بدن کو چھوا کچھ اچھا سا تو لگا لیکن کہیں کہیں کھردرے پن کا بھی احساس ہوا۔ مجموعی طور سے ان کے شعری احساسات واظہارات خوب ہیں مگر مسلسل ریاضت سے خوب تر کی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔

لئیق انصاری صاحب کے بعد ہم نے اس ذہنی پس منظر کے ساتھ اگلا صفحہ کھولا کہ مدیر اعلیٰ زبیر قادری صاحب ہمارے سامنے ہوں گے لیکن اس بار بھی محرومی ہاتھ آئی۔ یہ مسلسل تیسرا شمارہ ہے جس کے پیرہن قرطاس پر انہوں نے اپنے اداریے کے پھول نہیں ٹانکے ہیں۔ اس سبب کے جملہ حقوق زبیر قادری صاحب کے حق میں محفوظ ہیں۔

نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنے کے سلسلہ میں ڈاکٹر الطاف حسین سعیدی صاحب نے اپنی معلومات کی سطح سے غیر مقلدین پر قلمی یلغار کی ہے۔ ان کے مہمل اعتراضات کے جوابات کا عکس بھی سعیدی صاحب نے اپنی اس کاوش میں اتارا ہے۔ یہ عکسِ رنگ بہتر ہے لیکن ہمارے احساس کے کانوں میں چپکے چپکے کوئی کہہ رہا

ہے کہ سعیدی صاحب ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر ہیں۔ اگر یہ تحریر کسی ماہر حدیث کے قلم سے نکلی ہوتی تو ہماری دلچسپیوں کی باچھیں کھل جاتیں اور حدیث کے متعلق ہمارے ادنیٰ ذوق وشوق میں برق سی دوڑ جاتی۔ خیر اس تحریر میں چھپے ہوئے سعیدی صاحب کے جذبۂ دینی کو سلام۔ ...... قارئین افکاررضا کے پرانے واقف کار جناب خلیل احمد رانا صاحب نے اس شمارے میں ''داتا'' کے سلسلہ میں بہت مختصر تحریری اظہار یہ دیا ہے۔ داتا کے معنی ''دینے والا'' اور ''سخی'' اس مختصری تحریر کے مطاف ہیں۔ رانا صاحب ایک مقام پر رقم طراز ہیں ''انسان صفاتِ الٰہیت کا مظہر تو ہوسکتا ہے مگر صفتِ الوہیت کا مظہر ماننا شرک ہے۔'' خط کشیدہ الفاظ دماغ کے ریشم سے اُلجھ کر ہمارے سر پر رقصاں ہیں لیکن ہماری عقل ناتواں میں ان دونوں کے معنی نہیں سما پا رہے ہیں۔ رانا صاحب سے ہماری گزارش ہے کہ یہ تصوف کی باریکیاں ہیں ان کو ذرا واضح اور غیر مبہم انداز میں تحریر فرمایا کریں تاکہ ہم جیسے بیشتر قارئین تصوف کے محدود ترین مطالعے پر احساس کمتری کے شکار نہ ہوں اور تصوف بدنام ہونے سے بچ جائے۔

مولانا شکیل احمد قریشی نے تقاریظِ رضا کی روشنی میں ''بہار شریعت'' کی اہمیت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے بہار شریعت حصہ دوم، سوم، چہارم اور ششم پر تحریر کردہ امام احمد رضا بریلوی کی تقاریظ کی نقول پیش کی ہیں۔ قریشی صاحب کی یہ تحریر ویسے تو فی نفسہٖ بہتر ہے لیکن لفظ اور تقریظ کی جمع الجمع الفاظوں اور تقاریظیں استعمال کرنا ایک دم غلط ہے۔ ان کے علاوہ بھی چند خامیاں ہیں جنھیں دور کرنا بہت ضروری ہے۔...... جناب انوار محمد عظیم آبادی نے ''ایک اردو مخطوطہ میں ذکرِ رضا'' کی بازیافت فرمائی ہے۔ اپنے اس چھوٹے سے تحریری کاشانے میں انہوں نے اپنی تحقیقی کاوش کے جو رنگ بھرے ہیں وہ بہت خوب ہیں۔ اس تحریری معمورے میں دو تین جگہ انوار محمد کی کاوشِ ذہنی کا عکس کچھ بدنما سا لگا۔ موصوف اگر ہماری ناقص معلومات پر اعتبار کریں تو عرض ہے کہ اردو میں ''اہل سُنّت والجماعت'' کا استعمال بالکل غلط ہے یہاں اہل سُنّت وجماعت لکھا جائے گا۔ موصوف نے تین مقامات پر ''بریلوی مکتب فکر'' کو بھی تحریر کے دھاگے میں باندھا ہے۔ علما نے ''بریلوی مکتب فکر'' کو اپنی تحریر وتقریر میں اتنا زیادہ رواج دیا کہ ماضی کی فروگزاشتوں نے حال کے طاقوں میں اہل سُنّت و جماعت کے لیے اداسی کی ایک اور شمع فروزاں کردی ہے۔ ان علما کا بچا کھچا اثر اب تک بعض تقریر وتحریر میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ اب ہم لاکھ کوشش کریں کہ بریلوی مکتب فکر کا استعمال ہم اہل سُنّت وجماعت کے لیے ہمارے اعتقادی حریفوں نے کیا ہے لیکن دشمن کہاں ماننے والا ہے۔ اس کو تو ہمیشہ ایسے ہی حربوں کی تلاش رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک ہماری کوششوں کے ہاتھوں میں کامیابی کا گھر نہیں آسکا ہے۔ لہٰذا مضمون نگار سے ہماری پُرخلوص گزارش ہے کہ اس طرح کے لفظوں کو تحریروں میں تو بالکل بھی داخل ہونے کی اجازت نہ دیں، رہی بات ''مباحثات'' کے استعمال کی تو میں نے اپنے بے حد محدود مطالعاتی سفر میں اسے کہیں نہیں دیکھا۔

''تعلیماتِ اولیا اور جدید دور'' کے عنوان پر باباجی سید میر طیب علی شاہ بخاری صاحب کی تقریر اچھی

گی۔ بخاری صاحب کی طرح کسی کی تحریر وتقریر سے ''ہم استفادہ حاصل (نہیں) کرتے ہیں'' بلکہ فایدہ حاصل کرتے ہیں۔ اس لیے اس تقریر سے بھی ہم نے فایدہ حاصل کیا اور معلومات کی کچھ چڑیاں پکڑ کر اپنے ذھن کے پنجرے میں بند کیں۔

''اسلام میں جدّت پسندی'' کی زمین پر جناب جمال زار ابوزو اور مشتاق احمد ضیا صاحبان نے اپنی تحریر وترجمے کا خیمہ لگایا ہے۔ ہمیں یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ جمال ابوزو صاحب کی تحریر کس زبان میں تھی جس کا یہ ترجمہ مشتاق احمد ضیا صاحب کے قلم سے نمودار ہوا ہے۔ یہ مضمون بڑے فکر انگیز منطقوں سے نکل کر قارئین افکار رضا تک پہنچا ہے۔ یہ مضمون معلومات کے کئی جزیروں کی سیر کراتا ہے۔ موصوف نے اپنی اس تحریر میں جدّت پسندی کی تاریخ کو بھی ہلکی روشنی میں پیش کیا ہے۔ تحریر کو ہم نے پسندیدگی سے پڑھا اور مضمون نگار ومترجم کو مبارک باد دینے کے لیے تیار ہوگئے۔

کراچی یونی ورسٹی میں شعبۂ قرآن و سُنّت سے وابستہ جناب محمد اسماعیل احمد بدایونی صاحب نے ''حجاب اور تہذیبی وثقافتی دہشت گردی'' کے اردگرد اپنی کاوش کی تجسیم کاری کی ہے اور وہ اس میں پورے طور سے کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ حجاب کو جس طرح سے تہذیبی وثقافتی دہشت گردی سے خون آلود کیا جارہا ہے وہ دورِ حاضر کا خونچکاں باب ہے۔ اسلامی تعلیمات کے دشمنوں نے اپنے اقتدار کی حدود میں تو عظمتِ حجاب کو بے حجاب کیا ہی ہے۔ اسلامی ممالک میں بھی زبردستی دخیل بن کر مسلم خواتین کے سروں سے نقاب نوچ کر انہیں بے عزت کیا ہے۔ ان گھناؤنی کارروائیوں میں ''میر جعفروں'' اور ''میر صادقوں'' نے کلیدی رول ادا کیا ہے اور آج بھی یہ ''ننگِ دین'' گلے میں مسلمانیت کا پٹہ ڈال کر دندناتے پھر رہے ہیں۔ اسماعیل بدایونی صاحب نے ان ہی چیزوں کو اُجاگر کرنے کے لیے اپنے قلم کی قوت صرف کی ہے۔ ہم انہیں اپنی جانب سے تہنیت نامہ عطا کرتے ہیں۔

''آستانۂ خواجہ غریب نواز مرجع خلائق'' تحریر فرما کر غریب نواز کی بارگاہ میں محترم مفتی ولی محمد صاحب نے اپنی عقیدتوں اور محبتوں کا خراج پیش کیا ہے۔ مفتی صاحب نے حضور غریب نواز رضی اللہ عنہ کے مولد کا نام سنجر بتایا ہے۔ ہمارا چھوٹا موٹا مطالعہ اس کی تردید کرتا ہے۔ سرکار غریب نواز کی جاے پیدائش کا نام سجستان یا سیستان ہے جسے سجز بھی کہا جاتا ہے اسی بنیاد پر ان کے نام کے ساتھ سجزی (س ج زی) لکھا جاتا ہے۔ کتابت کی غلطی سے زا کا نقطہ تھوڑا مقدم ہوگیا اور لفظ محرف ہوکر سنجری ہوگیا اور بہت سارے لوگ بعض خواص بھی اپنی فکر وقلم کی قلمرو میں اس کے داخل ہونے سے نہ روک سکے۔ اب تو یہ اتنی کثرت سے استعمال ہورہا ہے کہ گویا یہی درست ہے۔ ہمارے مفتی صاحب قبلہ بھی اسی کی رَو میں بہتے چلے گئے اور سنجر لکھ ڈالا۔ اپنے مضمون کے اگلے صفحے پر موصوف نے اعلیٰ حضرت کا نام تحریر کرکے جس کتاب اور متعلقہ صفحے کا حوالہ دیا ہے وہ ایک دم غلط ہے۔ کتاب کا اصل نام ''احسن الوعالآداب الدعاء'' ہے۔ ممکن ہے کہ کمپوزر نے ''احسن'' کے الف کو حذف کرکے ''حسن'' کردیا ہو اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ کتاب اعلیٰ حضرت کی تصنیف نہیں بلکہ اُن کے والد ماجد علامہ نقی علی

خاں علیہ الرحمہ کی ہے۔ اس کتاب پر اعلیٰ حضرت کی تعلیقات ہیں جس کا نام ''ذیل المدعا لاحسن الوعاء'' ہے۔ اس تعلیق میں امام احمد رضا نے مفتی صاحب کی منقولہ یہ عبارت ''خواجۂ ہند کے مزار شریف پر دعا قبول ہوتی ہے۔'' تحریر نہیں فرمائی بلکہ امکنۂ اجابت کا تذکرہ فرماتے ہوئے ۳۹ رویں مکان کے تحت فرمایا۔ ''سی ونہم مرقد مبارک حضرت خواجہ غریب نواز معین الحق والدین چشتی قدس سرہ'' اور یہ عبارت صفحہ ۵۰ پر نہیں ۵۷ پر ہے۔ مفتی صاحب ہماری بات کی تصدیق کے لیے نوٹ فرمالیں کہ اس کتاب کی ناشر ''جماعت سابقہ ۱۹۹۴ء الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور'' ہے۔ زبیر قادری صاحب چاہے کتنی بھی کوشش کرڈالیں لیکن کمپوزنگ اپنا رنگ دکھا کر ہی رہتی ہے۔ چنانچہ اس مضمون میں دو مقام پر ''فی'' کی جگہ ''فی'' اور ''اجی'' کی جگہ ''اجبی'' لکھ گیا ہے۔ ویسے یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اردو کے رسائل و جراید میں کمپوزنگ کی خامیاں راہ پا ہی جاتی ہے۔

حضرت حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی عظیم شخصیت کو ''دینی اخلاص پروری اور ملی دردمندی کا روشن استعارہ'' کے خوب صورت پیرہن میں پیش کرنے والا کوئی اور نہیں یہی راقم السطور ہے۔ جو پچھلے ڈیڑھ سال سے افکار رضا کے شمارے پر تبصرہ لکھتا چلا آرہا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ اس نے افکار رضا کے صفحات پر کوئی مضمون لکھا ہے اور حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی بارگاہ میں تحریری طور پر عقیدتوں کی سوغات پیش کی ہے۔ اب یہ تو قارئین افکار رضا ہی بتا سکتے ہیں کہ اس کی فکر وقلم نے کتنی بار غلط جگہ پاؤں رکھا ہے۔

''تحریکِ ختم نبوت ۱۹۵۳ء کی لحہ بہ لحہ داستان'' پڑھ کر دل کی آنکھوں میں نمی اتر آئی اور یہ رقت انگیز اور کرب ناک داستان بہت دیر تک ذہن وفکر کے حواس پر چھائی رہی۔ اس پوری داستان کے لفظ لفظ سے جو جذبۂ دینی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں لفظوں کی اوٹ سے خاتم النبیین ﷺ سے جو سچی محبت اور مذہبی درد جھانک رہا ہے وہ جہاں ہمیں بے حد متاثر کررہا ہے وہیں وہ ہمارے خوابیدہ مذہبی جذبات کو بیدار کررہا ہے اور اسلام دشمنوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا مطالبہ کررہا ہے۔ یہ درد ناک داستان دراصل مولانا سید خلیل احمد قادری علیہ الرحمہ کا انٹرویو ہے جسے جناب شفقت عثانی اور جناب خلیل احمد رانا صاحبان نے مرتب فرمایا ہے۔ مولانا موصوف علیہ الرحمہ اور ان کے رفقا کو ختم نبوت کا عقیدہ رکھنے اور ''تحریکِ ختم نبوت'' چلانے کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی اور مہینوں جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہنا پڑا لیکن حکومتِ پاکستان ان حضرات کی عشق نبوی کی تپش کو کم نہ کرسکی اور نہ ہی تحریکِ ختم نبوت کو پابند سلاسل کرسکی۔ ذرا تصور کی آنکھ کھولیے کہ اگر ان حضرات نے اتنی عظیم قربانیوں کا لہو تحریکِ ختم نبوت میں نہ نچوڑا ہوتا تو آج پاکستان کے مذہبی معمورے میں کسی گمراہ جماعت کی حکمرانی ہوتی...... بہرحال یہ داستان پیش کرنے پر ہم مذکورہ دونوں صاحبان کے بے حد شکر گزار ہیں۔

حیدرآباد تو ہمیں اب تک دیکھنے کا موقع نہیں مل سکا ہے لیکن مولانا کوکب نورانی صاحب کی طویل ''ہند یاترا'' پڑھنے کے بعد ہمیں تصوراتی سطح پر حیدرآباد گھومنے پھرنے کا موقع مل گیا۔ اس پورے دلچسپ سفرنامے کو ہم نے بڑے مزے لے لے کر پڑھا۔ مولانا کوکب نورانی صاحب کے سفر ناموں کی ایک خوبی یہ ہے کہ ہم

جیسے کوتاہ فکر لوگ جن جزئی باتوں کا تذکرہ غیر ضروری سمجھتے ہیں، موصوف اپنی تحریری مہارت سے انہیں ضروری سمجھ کر اپنے حسنِ بیان میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ شروع میں کوکب صاحب نے حیدر آباد کی مختصر تاریخ بیان فرمائی ہے اور پھر اپنے سفر کا آغاز فرمایا ہے۔ اتنی عمدہ تحریر پر ان کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔

''تبصرۂ کتب'' میں اس مرتبہ چار کتابوں کا تبصرہ شامل کیا گیا ہے۔ پہلے تبصرہ نگار ''افکارِ رضا'' کے تقریباً مستقل مضمون نگار جناب غلام مصطفیٰ رضوی صاحب ہیں۔ انہوں نے ''جہانِ مفتیِ اعظم'' پر اپنا تبصراتی قلم دوڑایا ہے۔ رضوی صاحب نے اپنی اس تبصراتی تحریر کو سلیقے سے سجایا ہے۔ یہ سلیقہ مندی ہماری مبارکبادی چاہتی ہے۔ ان کی معلومات کے لیے اتنا ضرور عرض کرنا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب ''بڑے سائز'' کی نہیں بلکہ کتابی سائز کی ہے۔

دوسری زیر تبصرہ کتاب مولانا ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی کی تحریری کاوش ''حیاتِ رضا کی نئی جہتیں'' ہے جسے محترم مفتی ولی محمد رضوی صاحب نے تبصرے کی میز پر سجایا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ مفتی صاحب نے تبصرہ نگاری کے اصول و آداب کی پاس داری نہیں کی ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے اگر وہ مذکورہ کتاب کے شروع کے ہی ایک دو صفحات پڑھ لیتے تو شاید اس تبصرے کا مزاج بدلا ہوا ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ مفتی صاحب مصنف کی لمبی چوڑی تصنیفی و تالیفی کتب کی فہرست دیکھ کر ہی مرعوب ہوگئے تھے اور اس مرعوبیت کے سائے میں بیٹھ کر یہ تبصرہ رقم کیا گیا ہے۔ اس تبصرہ میں موصوف نے تحریر فرمایا ہے کہ اعلیٰ حضرت سے پہلے ۲۰۰ کتب پر حواشی لکھے گئے جب کہ صحیح تعداد ۲۳۲ ہے جو شمس مصباحی صاحب کی اسی کتاب میں درج ہے۔

جناب اقبال احمد فاروقی صاحب ایڈیٹر ''جہانِ رضا'' لاہور کے اداریوں کے مجموعے ''باتوں سے خوشبو آئے'' پر غالباً اُن کے رفیق محترم ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی کا تبصرہ بھی شریک اشاعت ہے۔ نظامی صاحب نے اس کتاب کے ایک باب ''عیسائی مبلغین اور علماے اسلام'' کے سلسلہ میں ہی اپنے احساسات کو قلم کے زینے سے قرطاس کی زمین پر اُتارا ہے۔ پوری کتاب پر تبصرہ نہ ہونے کے بارے میں ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں کہ وہ لکھ چکے ہیں ''میرے نزدیک یہ اس کتاب کا بہت اہم باب ہے۔'' نظامی صاحب نے مزید اقبال احمد فاروقی صاحب کے تعلق سے ڈیڑھ صفحہ میں اپنے ماضی کی یادوں کو کھنگالا ہے اور ان کو قارئین میں بھی تقسیم کیا ہے۔

پروفیسر فاروق احمد صدیقی صاحب نے ڈاکٹر غلام جابر شمس مصباحی صاحب کی تصنیف ''پروازِ خیال پر اک طائرانہ نظر'' ڈالی ہے۔ یہ کتاب شمس مصباحی صاحب کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ پروفیسر صاحب نے ان کے ۳ مضمون کے ۳ اقتباس بھی دیے ہیں۔ پڑھ کر حظ محسوس ہوا۔ انہوں نے فکر کی ریت سے اس الگ سی نوعیت کی تحریر کا چشمہ نکالا ہے۔ پروفیسر صاحب نے ایسی تحریروں کو کہا ہے کہ ''یہ انشائیہ کے قریب ضرور ہیں'' اور سچ کہا ہے۔

مضامین کے اختتام کے بعد اب ''رضا نامے'' کا نمبر آتا ہے۔ پہلا رضا نامہ حیدر آباد، دکن سے شاہ فصیح الدین نظامی صاحب کا ہے۔ مولانا توفیق احمد نعیمی صاحب کے لیے یہ مکتوب نہایت اہمیت کا حامل ہے۔

گزشتہ شمارے میں مولانا توفیق کا ایک مضمون بلکہ یوں کہیے کہ ایک رسالہ ''اعلیٰ حضرت پر کتابیں'' شائع ہوا تھا، فصیح الدین نظامی صاحب نے اس میں دو اہم غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔

دوسرا رضا نامہ بشکل تبصرہ کا مصوّر راقم السطور ہے۔ اس میں ایک مقام پر ہم نے تجسس کے ساتھ ''تخصص'' لکھا تھا لیکن کمپوزر صاحب نے ہمیں بھی نہیں چھوڑا اور اسے ''تخصص'' بنا ڈالا۔ دراصل ہم سے بھی یہاں چوک ہوئی صحیح لفظ ''تفحص'' ہے جسے ہمارے قلم کی زبان نے ''تخصص'' ادا کیا ہے۔ ان دو کے علاوہ جناب سلیمان سبحانی، جناب مولانا مبین الہدیٰ مصباحی اور جناب م لئیق انصاری کے رضا ناموں سے بھی ان کے اظہارات کی دھڑکنیں صاف سُنی جاسکتی ہیں۔ اس شمارے میں چھ تحریری اظہاریے دوسرے رسائل و جراید سے گزر کر افکار رضا کے صفحات تک آئے ہیں اور معلومات کے نئے نئے گوشے ساتھ لائے ہیں۔ اخیر میں محترم زبیر قادری پر گلہائے مبارک باد اس لیے نثار کر رہے ہیں کہ یہ پورا شمارہ پچھلے کئی شماروں سے عمدہ ہے۔ امید ہے کہ اسے دلچسپی سے پڑھا گیا ہوگا۔

○ **علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی**، مولانا اوکاڑوی اکادمی العالمی، کراچی، پاکستان

پنجاب کے مردم خیز خطّے میں سیال کوٹ شہر کی شہرت اب آلاتِ جراحی اور کھیل کے سامان بنانے کی وجہ سے ہے اور یہاں کے تاجر اپنی مدد آپ کے تحت اس شہر میں ایرپورٹ خود تعمیر کر رہے ہیں۔ شاعر مشرق کی نسبت سے اِسے ''شہرِ اقبال'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس شہر کی اصل شہرت ایمانی، روحانی اور علمی شخصیات کے حوالے سے تھی۔ صدیاں گزر گئیں، ان ہستیوں کا ذکر اب بھی عقیدت و احترام سے کیا جاتا ہے۔ امام ربانی حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی رحمۃ اللہ علیہ کو ''مجدِّد الف ثانی'' قرار دینے والے حضرت مولانا عبدالحکیم سیال کوٹی علیہ الرحمہ کا تعلق بھی اسی شہر سے تھا۔

اس شہر سیال کوٹ کے مضافات میں ''کوٹلی لوہاراں'' کا مختصر سا علاقہ، حضرت مولانا ابو یوسف محمد شریف محدّث کوٹلوی علیہ الرحمہ کی وجہ سے خوب پہچانا جاتا ہے۔ اُن کی علمی مرتبت اور نیکی کا سبھی اعتراف کرتے ہیں۔ انھیں اعلیٰ حضرت، مجدّدِ دین و ملّت مولانا شاہ احمد رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اجازات اور خلافت حاصل تھی۔ ان کے فرزند و جانشین حضرت علامہ ابوالنور محمد بشیر کو ''سلطان الواعظین'' کے لقب سے یاد کیا گیا۔ ماہ نامہ ''ماہِ طیبہ'' ایک وقیع جریدہ تھا، اس کی ادارت، تصنیف و تالیف اور خطابت میں نصف صدی سے زاید عرصہ وہ مشغول رہے۔ مسلکِ حق اہلِ سُنّت و جماعت کی پاس بانی اور تبلیغ و اشاعت میں ہمہ دم سرگرم عمل رہے۔ اُن کی تقاریر قلم بند کر کے کتابوں میں محفوظ کی گئیں، ان کتابوں سے سیکڑوں واعظین استفادہ کرتے رہے۔ سرزمینِ پنجاب میں ایک وقت تھا کہ اُن کی دھوم تھی۔ علم و عمل میں وہ یادگارِ اسلاف تھے۔

اپنی عمر عزیز کی عیسوی تقویم کے مطابق ۹۴ بہاریں دیکھنے کے بعد ہفتہ ۴ر اگست ۲۰۰۷ء کو وہ راہی جناں ہوئے (انا للہ وانا الیہ راجعون) اللہ کریم جل مجدہٗ اُن کو فردوسِ اعلیٰ میں مقامِ رفیع عطا فرمائے، آمین اُن کی رحلت سے ملک و ملّت ایک مقتدر شخصیت سے محروم ہوئے ہیں۔ اللہ کریم جل شانہٗ اُن کے

اخلاف کو اُن کی خوبیوں کا وارث بنائے اور اس علمی گھرانے سے دینی علمی خدمات کا سلسلہ جاری رہے۔

<u>مادّہ ہائے سن وصال</u>

☆ علامۂ دین سلطان الواعظین
۱۴۲۸ھ

☆ اللّٰھم یا قدیر اغفرلہ وارحمہ
۲۰۰۷ء

☆ یک پاس بانِ دین سلطان الواعظین
۱۴۲۸ھ

☆ ''واہ ترجمانِ فکرِ رضا
۲۰۰۷ء

○ڈاکٹر صابر سنبھلی، سنبھل، مراد آباد

حضرت علامہ تحسین رضا صاحب قبلہ اور مولانا عبدالحکیم شرف قادری صاحب کے وفات کی تاریخیں ہوگئی ہیں۔ آپ کو ارسال کررہا ہوں۔ مناسب سمجھیں تو شائع کردیں۔

رباعی تاریخ وفات قطب ربانی
۲۰۰۷ء

مولانا تحسین رضا صاحب ولی اللہ
۲۰۰۷ء

رنجور و بے قرار۔ صابر سنبھلی
۲۰۰۷ء

مَیں پوچھتا تھا مجھ کو بتایا جائے
اس عہد میں ہے کون جو جنت پائے
ہاتف نے سُنا اور کہا سُن صابر
فردوس میں تحسین رضا بھی آئے
۲۰۰۷ء

<u>قطعہ تاریخ وفات معہود</u>
۲۰۰۷ء

☆ بلند اقبال مولانا عبدالحکیم شرف قادری
۱۴۲۸ھ

☆ رنجور و پراگندہ خاطر۔ صابر سنبھلی
۲۰۰۷ء

مایۂ سُنّیاں جہاں میں نہیں
اُف کروں کیسے اس خبر پہ یقیں
تھا اسی فکر میں کہ آئی ندا
اس جہاں میں وہ اب نہیں ہیں کہیں
پوچھا مَیں نے کہ کون ہے تو بتا؟
اور یہ بھی کہ وہ کہاں ہیں مکیں
دی ندا ''ہوں سروش صابر سُن''
اب شرف قادری ہیں خلد نشیں
۲۰۰۷ء

<u>ضروری اعلان</u>: ان شاء اللہ عزوجل اگلا شمارہ (اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء) ۵۰ واں شمارہ ہونے کی نسبت سے خاص نمبر ہوگا۔ جو تقریباً ۵۰۰ صفحات پر مشتمل ہوگا۔ یہ شمارہ بلا قیمت (مفت) نہیں دیا جائے گا۔ ہدیہ: سو-/100 روپے ہوگا۔ اپنی کاپیاں بک کرالیں۔ سہ ماہی افکار رضا کا یہ آخری شمارہ ہوگا۔

<u>نوٹ</u>: رابطے کا پتہ تبدیل ہوگیا ہے۔ صفحہ اوّل سے نوٹ کرلیں۔ آیندہ خط و کتابت نئے پتے پر کیجیے۔

تحریک فکر رضا

ہمارے مقاصد :

☆ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے افکار ونظریات کو زیادہ سے زیادہ متعارف کرانا۔

☆ علماء اہل سُنّت وجماعت کی رہنمائی میں مفکرین اور محققین کی ایک ٹیم کا فکر رضا کی ترویج واشاعت میں دن رات کوشاں رہنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو سہل انداز میں جدید اسلوب کے ساتھ شائع کرنا۔

☆ امام احمد رضا کی تصانیف کو ملک کی مختلف اور بین الاقوامی زبانوں میں شائع کرانا۔

☆ اربابِ فکرودانش کو امام احمد رضا کی تحقیقات کی طرف متوجہ کرنا۔

☆ ہر اُٹھتے ہوئے سوالوں کا امام احمد رضا کی تحقیقات کی روشنی میں جواب دینا۔

فکر رضا کو عام کرنے کے لیے آپ ہمارا تعاون کیجیے۔
آپ کا تعاون جہاد بالقلم میں ہمارا مددگار ہوگا۔

AFKAR-E-RAZA (URDU QUARTERLY)
95, Undria Street, Chowki Mohalla, Mumbai - 400 008. E-mail : editor@fikreraza.net

If Undelivered Please return to : M. ISHAQ 45/A, Memonwada Road, 2/6, Mumbai - 400003.

بشکریہ جناب خلیل احمد رانا صاحب

پیشکش:۔ محمد احمد ترازی